عقیدۃ السنّي

تالیف

امام العصر علامہ نواب محمد صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ

(۱۲۴۸ھ-۱۳۰۷ھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذي يسبح له أهل السماوات والأرض ومن فيهن، لا يبغون عنه حولا، ولا به بدلا، والصلاة والسلام على خير خلقه محمد وآله و صحبه الذين آمنوا و عملوا الصالحات، و كانت لهم جنات الفردوس نزلا.

اللہ تعالیٰ، فرشتوں، جن و انس، آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو میں گواہ بناتا ہوں کہ تہ دل سے میرا عقیدہ یہ ہے:

خالقِ کائنات:

اس جہانِ فانی کا ایک بنانے والا موجود ہے جس نے اس جہان کو عدم سے ایجاد کیا اور قانونِ حکمت پر اس کی ترتیب رکھی۔ اس عالم کا وہ موجد اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے، جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ [الأعراف: ٥٤]

[بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا]

مزید فرمایا:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ﴾ [الزمر: ٦٢]

[اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے]

نیز فرمایا:

﴿اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [إبراهيم: ١٠]

[کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟]

قرآن مجید میں مزید پانچ سو آیات موجود ہیں جو اس کائنات کے بنانے والے کے ثبوت اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ فطرتِ انسانی اس دعوے پر برہان و حجت قائم کرنے سے مستغنی ہے۔

تنزیہ باری تعالیٰ:

وہ کبیر، عظیم، بہت بلند اور ساری صفات کمال جیسے علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، تکوین، کلام، ترزیق، تخلیق اور اسی جیسی دیگر صفات کے ساتھ متصف ہے۔ وہ نقص و زوال والی تمام صفات جیسے عجز، جہل، کذب اور موت سے منزہ اور پاک ہے۔

صفتِ خلق:

عالمِ ملک و اشباح ہوں یا عالمِ ملکوت و ارواح، جتنی بھی مخلوقات ہیں، سبھی کو اس نے پیدا کیا ہے۔ ''خلق'' کا مطلب ہے کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ اسی خلق کے باوصف وہ خالق ہے۔

علمِ الٰہی:

جتنی بھی معلومات ہیں، وہ جزئیات وکلیات ہوں یا ممکنات و مستحیلات، وہ ان سب کو جانتا ہے۔ زمین کی تہ سے لے کر آسمانوں کی چوٹی تک جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب اس کو معلوم ہے۔ کیا مجال ہے کہ سارے آسمانوں اور زمینوں میں ایک ذرہ بھی اس سے چھپا رہ جائے۔ اندھیری رات میں کالے پتھر پر اگر کالی چیونٹی چلتی ہے تو اسے بھی وہ جانتا ہے۔ ہوا میں اگر ایک ذرہ حرکت کرتا ہے تو وہ بھی اس کو معلوم ہے۔ نیز وہ دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات، طبیعتوں کے رجحانات اور پوشیدہ باتوں پر مطلع ہے۔ وہ خود ہی فرماتا ہے:

﴿ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ﴾ [الملك: ١٤]

[کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے]

نیز اس کا فرمان ہے:

﴿ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ [البقرة: ٢٩، الأنعام: ١٠١]

[اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے]

مزید فرمایا:

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ [الطلاق: ١٢]

[اور یہ کہ بے شک اللہ نے یقیناً ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے]

اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم اس کی دیگر بڑی صفات میں سے سب سے بڑی صفت ہے، اس لیے اس نے فرمایا ہے:

﴿ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام: ٥٩]

[اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا]

اس عقیدے سے ''شرک فی العلم'' کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

قدرت:

جتنی بھی ممکنات ہیں، وہ ان سب پر قادر ہے۔ کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ قدرت سے مراد یہ ہے کہ وہ عالم کو ایجاد کرے یا نہ کرے، وہ قادر ہی ہے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ﴾ [یٰس: ٨١]

[اور کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے اور پیدا کر دے؟ کیوں نہیں اور وہی سب کچھ پیدا کرنے والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے]

ارادہ:

ساری کائنات اس کے ارادے کے ساتھ ہے۔ یہ ارادہ دو طرح کا ہے۔ ایک قدریہ کونیہ خلقیہ جو تمام موجودات کو شامل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ [الأنعام: ١٢٦]

[تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے، اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے]

دوسرا ارادہ دینیہ امریہ شرعیہ ہے، جو محبت و رضا کو متضمن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ١٨٥]

[اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا]

شرعی امر اسی دوسرے ارادے کو مستلزم ہوتا ہے نہ کہ پہلے ارادے کو۔

غرض کہ سارے ملک وملکوت میں جو کچھ جاری ہوتا ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ، نیک ہو یا بد، نفع ہو یا نقصان، شیریں ہو یا تلخ، ایمان ہو یا کفر، معروف ہو یا منکر، کامیابی ہو یا ناکامی، زیادتی ہو یا نقصان، اطاعت ہو یا نافرمانی؛ وہ سب اس کے ارادے سے ہے اور اس کی حکمت و تقدیر کے مطابق ہے۔ جو وہ چاہتا ہے، ہو جاتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا، نہیں ہوتا۔ کیا مجال ہے کہ ساری کائنات جمع ہو کر ایک ذرے کو حرکت دے یا متحرک کو ساکن کر دے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [التكوير: ٢٩]

[اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے]

اس عقیدے سے ''شرک فی التصرف'' کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ وللہ الحمد۔

سمع وبصر:

اللہ تعالیٰ تمام آوازیں، حروف اور کلمے سنتا ہے۔ ساری شکلیں اور رنگتیں دیکھتا ہے۔ اس کے سمع و بصر سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، خواہ وہ کتنی ہی باریک کیوں نہ ہو۔ بُعد اور دوری اس کے سمع کے لیے رکاوٹ نہیں ہے اور تاریکی اس کے بصر کو دور نہیں کرتی ہے۔ سمع و بصر دونوں صفتیں صفتِ علم سے علاحدہ ہیں۔ قرآن مجید کا تتبع اور مطالعہ کرنے سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

تشبیہ وتعطیل کی نفی:

اللہ کا کوئی شبیہ، ضد، ند اور مثل نہیں۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی مخلوق کو تشبیہ دی، وہ اللہ کی ذات یا صفت یا فعل کا منکر ہوا۔ سلف صالحین اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان کے ظاہر پر جاری کرتے تھے اور ان کو کسی سے تشبیہ نہیں دیتے تھے۔ وہ تاویل وتعطیل وتکییف سے بچتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبياء: ٢٢]

[اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے]

یہ ضد کی نفی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی "ضد" نہیں ہے۔ نیز اس نے فرمایا:

﴿فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا﴾ [البقرة: ٢٢] [پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ]

یہ اللہ تعالیٰ کے "ند" کی نفی ہے۔ مزید فرمایا:

﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ﴾ [الشورىٰ: ١١] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں]

یہ اجمالی کلمہ ہر تمثیل وتشبیہ کا علاج ہے۔

استحقاقِ عبودیت:

وجوبِ وجود، استحقاقِ عبادت اور خلق و تدبیر میں کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ہے۔ بقا اسی کو ہے، باقی سب فانی ہیں۔ وہی معبود برحق ہے، باقی سب باطل ہیں۔ خالق و مدبر وہی ہے، باقی سب مخلوق و عاجز ہیں۔ عبادت کا معنی ہے غایت درجہ کی تعظیم بجا لانا اور اس کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے غیر اللہ کی عبادت کی جڑ کٹ گئی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ [الفاتحة: ٥]

[ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں]

شفا اور رزق:

بیمار کو شفا دینا، محتاج کو رزق دینا اور بلا و آزمائش کا ٹالنا اسی کا کام ہے۔ اس کے ایک حرف "کُنْ" (ہو جا) کہنے سے ہر کام ہو جاتا ہے۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ﴾ [الشعرآء: ٨٠]

[اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے]

نیز فرمایا:

﴿اَمَّنۡ يُّجِيۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكۡشِفُ السُّوۡٓءَ﴾ [النمل: ٦٢]

[یا وہ جو لاچار کی دعا قبول کرتا ہے، جب اسے پکارتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے]

مزید فرمایا:

﴿وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [البقرة: ١١٧]

[اور جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے]

یہ کہنا کہ طبیب اور ڈاکٹر نے شفا دی یا امیر اور بادشاہ نے رزق دیا لفظ کا اشتباہ ہے۔ یہ تسببِ عادی یہاں مراد نہیں ہے، کیوں کہ ان کاموں میں اللہ تعالیٰ کا کوئی وزیر اور مددگار نہیں ہے۔

وحدت الوجود کی مذمت:

وہ اپنے غیر میں حلول نہیں کرتا۔ وہ اس عالم کائنات سے جدا عرش کے اوپر ہے۔ کوئی غیر اس میں حلول کرتا ہے اور نہ وہ ہی کسی غیر کے ساتھ متحد ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنی ذات وصفات اور افعال میں یکتا ہے۔ اس اعتقاد سے وحدتِ وجود کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

حدوث:

اس کی ذات کے ساتھ کوئی حادث قائم ہے نہ اس کی ذات میں کوئی اور حدوث ہے، بلکہ یہ حدوث تعلقِ صفات میں متعلقات کے ساتھ ہے، جبکہ ارادہ اس کے وقوع کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، یہاں تک کہ وقتاً فوقتاً اس کے افعال ظاہر ہوتے ہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ تعلق بھی حادث نہیں ہے۔ تعلق کے ظہور میں احکام کا تفاوت وفرق متعلقات کے تفاوت وفرق کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ وگرنہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہر طرح کے حدوث وتجدد اور تغیر وتبدل سے بری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا تعارف:

قرآن مجید میں ذاتِ باری تعالیٰ کے تعارف کے لیے استعمال ہونے والے کلماتِ طیبات ہیں:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ [سورة الإخلاص]

[کہہ دے! وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ ہی بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے]

یہ کلمات اہلِ کلام کی اس خود ساختہ عبارت سے بہتر ہیں کہ اللہ تعالیٰ جوہر ہے نہ عرض، جسم ہے نہ متحیز، وہ کسی جہت میں ہے نہ قرب و بعد کے ساتھ مشار الیہ، اس کے لیے نقل وحرکت صحیح ہے نہ

اس کی ذات وصفات میں تبدل ہوتا اور نہ اس میں جہل وکذب جیسے نقائص ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ مذکورہ الفاظ کے معانی درست ہیں، لیکن ذاتِ الٰہیہ کے لیے کتاب وسنت میں استعمال ہونے والے الفاظ کے سامنے ان لفظوں کی کوئی حاجت اور حیثیت نہیں ہے۔

استوا علی العرش:

اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر قرآن مجید میں سات جگہ پر آیا ہے اور احادیث میں بے شمار جگہ یہ صفت مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اپنا وصف استوا علی العرش بیان کیا ہے، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ہمیں اس کی کیفیت جاننے اور اس کی تاویل کرنے سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے علو وتفوق اور اس علیِ واَعلی کے عرش عظیم پر مستوی ہونے کے ثبوت پر قرآن وحدیث میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔ ان دلائل کا ایک خاطر خواہ حصہ رسالہ ''الانتقاد الرجیح بشرح الاعتقاد الصحیح'' میں ذکر کیا گیا ہے۔ سارے سلف صالحین یعنی صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین رضی اللہ عنہم اسی کے قائل تھے۔

اللہ تعالیٰ کے تفوق اور استوا کی کنہ (حقیقت) اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ جو لوگ علم میں پختہ ہیں، وہ تو اس کے متعلق یہ کہتے ہیں:

﴿ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ﴾ [آل عمران: ٧]

[ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے]

قواعدِ عربیت کے مطابق یہی قول آیت کے ظاہر کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

سیدنا انس، ابو امامہ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ''راسخین فی العلم'' کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ بَرَّتْ يَمِيْنُهٗ، وَصَدَقَ لِسَانُهٗ، وَاسْتَقَامَ قَلْبُهٗ، وَعَفَّ بَطْنُهٗ وَفَرْجُهٗ، فَذٰلِكَ مِنَ الرَّاسِخِيْنَ فِي الْعِلْمِ »[1]

[وہ جو قسم اور بات میں سچا، دل کا سیدھا اور شکم وشرمگاہ کا پارسا ہے، وہ ''راسخین فی العلم'' میں سے ہے]

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥٩٩/٢) المعجم الكبير للطبراني (١٥٢/٨) اس کی سند میں ''عبداللہ بن یزید بن آدم'' ضعیف ہے۔

رویتِ باری تعالیٰ:

قیامت کے دن جنت میں جانے سے پہلے اور جنت میں جانے کے بعد مومن اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جس طرح وہ چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہیں، جس کے دیکھنے میں کوئی دھوکا اور شک وشبہہ نہیں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ دیدار دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مومن بندے نے اللہ تعالیٰ کی عقل سے جو تصدیق کی تھی، اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا اس سے زیادہ مکمل طور پر انکشاف ہوگا، گویا وہ آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ مگر اس دیکھنے میں اللہ کے رو در رو، آمنے سامنے، کسی جہت میں اس کے رنگ اور شکل وصورت کا دیکھنا کچھ بھی نہیں ہوگا، معتزلہ اسی کے قائل ہیں۔ معتزلہ کے اس موقف میں غلطی یہ ہے کہ انھوں نے رویت کو اسی ایک صورت میں منحصر سمجھ لیا ہے۔

دوسرا دیکھنا اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سی صورتوں میں مخلوق کے سامنے ظاہر ہوگا، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ يَتَجَلّٰى بِصُوَرٍ كَثِيْرَةٍ لِأَهْلِ الْمَوْقَفِ»

[یقیناً اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) محشر والوں کے لیے مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوگا]

ایک حدیث میں یوں فرمایا:

«أَدْخُلُ عَلٰى رَبِّيْ وَهُوَ عَلٰى كُرْسِيِّهٖ»

[میں اپنے رب کے پاس اس وقت آؤں گا، جب وہ اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوگا]

ایک حدیث میں اس طرح فرمایا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ يُكَلِّمُ ابْنَ آدَمَ شَفَاهًا»[1]

[یقیناً اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) ابن آدم سے بالمشافہہ کلام کرے گا]

اس صورت میں دیدارِ الٰہی ذاتِ الٰہی کی صورت اور اس کا رنگ بالمشافہہ دیکھنے کے ساتھ ہوگا، جس طرح خواب میں اتفاق ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "واستفاض في الحديث أن الله تعالىٰ يتحلىٰ بصور كثيرة لأهل الموقف، وأن النبي ﷺ يدخل على ربه وهو على كرسيه، وأن الله تعالىٰ يكلم ابن آدم شفاها" (حجة الله البالغة: ١/ ٤٤)

«رَأَيْتُ رَبِّي فِي أَحْسَنِ صُوْرَةٍ»[1]

[میں نے (خواب میں) اپنے رب تعالیٰ کو حسین تر صورت میں دیکھا]

اس کے علاوہ بہت سے صلحا نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ہے اور بار ہا دیکھا ہے۔ غرض کہ دنیا میں جو کچھ خواب میں دیکھتے ہیں، وہاں قیامت کے دن اسے بالمشافہہ رو در رو دیکھیں گے۔

ہماری سمجھ میں رویتِ باری تعالیٰ کی یہی دو صورتیں آئی ہیں۔ اگر اللہ و رسول کی مراد اس رویت سے کچھ اور ہو تو ہم اس پر ایمان لائے ہیں، گو بعینہٖ ہمیں یہ معلوم نہ ہو۔

مشیتِ الٰہی:

حدیث میں آیا ہے کہ جو اللہ نے چاہا وہ ہوا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ لہٰذا کفر و شرک اور سب گناہ، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اسی کی خلق و ارادے سے ہیں، اگرچہ وہ کفر و معصیت کے ارتکاب سے ناراض اور اطاعت و ایمان سے راضی ہوتا ہے، کیونکہ ارادہ اور چیز ہے اور رضا اور چیز۔ وہ اپنی ذات و صفات میں سارے جہاں سے بے نیاز ہے، اس پر کوئی حاکم نہیں ہے، سب پر اسی کا حکم چلتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ [الحج: ١٨] [بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے]

اور سورت مائدہ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ [المائدة: ١]

[بے شک اللہ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے]

مزید فرمایا:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٣]

[اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے]

دعائے قنوت میں یہ الفاظ مروی ہیں:

«فَإِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ»[2]

[تو یقیناً تو ہی فیصلہ کرتا ہے تیرے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا ہے]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٤)

[2] سنن أبي داود (١٤٢٥) سنن الترمذي (٤٦٤) سنن النسائي (١٧٤٥) سنن ابن ماجه (١١٧٨)

ایفائے عہد:

کسی کے واجب اور لازم کرنے سے اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ براہِ کرم و فضل خود کوئی وعدہ کرے، پھر اس وعدے کو پورا کرے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ»[1]

''یقیناً اللہ نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ (کر فرض کر) دیا ہے۔''

اس کا مطلب اللہ کی طرف سے سچا وعدہ ہے، اس سے اس کے ذمے کچھ واجب اور لازم کر دینا مقصود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال پُر حکمت ہیں اور وہ ہمیشہ سے ہمیشہ تک حکیم و علیم ہے۔

اس کا فرمان ہے:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾ [المؤمنون: ١١٥]

[تو کیا تم نے گمان کر لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ بے شک تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟]

مگر اپنی حکمت کی مصلحت کلیہ کو وہ خود ہی جانتا ہے۔ کوئی اور اسے کیا جانے؟

حاکم مطلق:

اللہ پر نہ لطف جزئی خاص واجب ہے نہ اصلح خاص اور نہ اس سے کوئی قبیح امر سرزد ہوتا ہے۔

«اَلشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ»[2] [شر و برائی تیری طرف نہیں ہے]

وہ اپنے فعل و حکم میں جور و ظلم کا مرتکب نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے خلق و امر میں حکمت کی رعایت تو رکھتا ہے، مگر اس سے وہ اپنے نفس و صفات کو کامل کرتا ہے، نہ اس کی کوئی حاجت و غرض کسی سے اٹکی ہوئی ہے، بلکہ اس کے سوا کوئی حاکم ہی نہیں ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ [يوسف: ٤٠] [حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں]

اشیا کا حسن و قبح:

اشیا کے حسن و قبح میں عقل کا کچھ دخل ہے نہ اس بات میں کہ فلاں فعل ثواب کا سبب ہے اور

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٢٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧١)

فلاں امر عذاب کا سبب ہے، بلکہ ہر چیز کی خوبی اور عیب اللہ کے قضا و قدر اور اس کے حکم و امر سے ہے، اسی نے لوگوں کو اس کا مکلّف ٹھہرایا ہے۔ اگر چہ بعض اشیا کے ثواب و عقاب کی مصلحت اور مناسبت عقل سے معلوم ہو جائے، وگرنہ بعض علل کا ادراک رسول اللہ ﷺ کے بتائے بغیر معلوم نہیں ہوتا ہے۔

صفاتِ باری تعالیٰ:

اللہ کی ہر صفتِ ذات جیسے علم، قدرت، حیات، کلام، سمع، بصر، ارادہ اور مشیت ہو یا ہر صفتِ فعل جیسے تخلیق، ترزیق، ابداع، احیا، اماتت، انبات، انما، تصویرِ اشیا اور اس جیسی دیگر صفات ہوں، ان میں سے ہر صفت واحد بالذات ہے نہ متکرر ہے نہ متعدد۔ وہ ایک ہی فعل سے سارے مفعولات کو ادا کرتا ہے، جس طرح وہ ایک ہی سمع سے سارے مسموعات کو سنتا ہے۔ اور ایک کلام سے سارے کلمات کے ساتھ تکلم فرماتا ہے، اور ایک ہی حیات کے ساتھ حیی و قیوم ہے، یہی حال اس کی باقی صفات کا ہے۔ جو تکثر و تعدد سمجھ میں آتا ہے، اس کا اثر نہ اسماے صفات میں ہے اور نہ نفسِ صفات ہی میں۔

فرشتے:

اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جن کا مسکن بلند و بالا آسمان ہیں۔ ان فرشتوں کو ملأ اعلیٰ کہتے ہیں۔ وہ اللہ کے بے حد مقرب ہیں۔ وہ دو دو، تین تین اور چار چار پر رکھتے ہیں۔ وہ لطیف ہوائی جسم رکھتے ہیں اور مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ ان کا نر یا مادہ ہونا کسی نقلی یا عقلی دلیل کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ بت پرستوں نے انھیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیا، مگر یہ محال باطل ہے اور ان کی شان میں افراط ہے۔ سچ تو یہ ہے:

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٦] [بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے]

وہ ہر گناہ سے معصوم ہیں۔ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ وہ وحی پہنچانے کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ وہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، پھر باوجود اس قرب اور قدر و منزلت کے تمام مخلوقات کی طرح علم رکھتے ہیں نہ قدرت۔ علم ہے تو وہ ہی جو اللہ نے بتا دیا ہے اور قدرت ہے تو صرف اتنی جتنی اللہ نے عطا کر دی ہے۔ وہ ہماری طرح اللہ کی ذات و صفات پر ایمان رکھتے ہیں۔

اللہ کی صفات واجبیہ میں یا عبادت میں کسی بندہ خاص کو، خواہ وہ فرشتہ ہو یا رسول، شریک

ٹھہرانا کفر ہے۔ کچھ فرشتے بندوں کے اعمال لکھنے پر مقرر ہیں۔ وہ بندے کو ہلاکت میں پڑنے سے بچاتے ہیں، نیکیوں کی طرف دعوت دیتے ہیں، دل میں خیر و بھلائی کی فکر ڈالتے ہیں۔ ہر فرشتے کی ایک الگ معلوم جگہ مقرر ہے۔ فرشتوں کا دلی خیالات پر اثر یہ ہوتا ہے کہ بندے کو خیر و بھلائی کے ساتھ انس اور اس کی طرف رغبت ہوتی ہے اور شیاطین کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دل میں وحشت محسوس ہوتی ہے اور شر و برائی کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ انھیں جو حکم ہوتا ہے، وہی کرتے ہیں۔ شیاطین ابن آدم کے دل میں شر ڈالتے اور خون کی طرح رگوں میں دوڑتے پھرتے ہیں اور وسوسہ انگیز ہوتے ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ [الفاطر: ٦]

[بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے تو اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے گروہ والوں کو صرف اس لیے بلاتا ہے کہ وہ بھڑکتی آگ والوں سے ہو جائیں]

فرشتے اور شیاطین کے وجود کا انکار صریح کفر ہے۔ ابلیس جن تھا۔ فرشتے نور سے اور جن و شیاطین آگ سے پیدا ہوئے ہیں اور آدمی مٹی سے۔

قرآن مجید کلام الٰہی ہے:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے محمد ﷺ پر نازل کیا ہے۔ صحیح حدیث میں قرآن مجید پر حرف اور صوت (آواز) کے اطلاق کا ذکر موجود ہے۔[1] قرآن مجید کو کلام نفسی کہنا بے دلیل ہے۔ قرآن مجید پڑھی جانے والی، تلاوت کی جانے والی، سنی جانے والی، لکھی جانے والی اور حفظ کی جانے والی کتاب ہے۔

قرآن مجید میں وحی کی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ [الشورىٰ: ٥١]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٠)

[اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی رسول بھیجے، پھر اپنے حکم کے ساتھ وحی کرے جو چاہے]

اسما وصفاتِ باری تعالیٰ توقیفی ہیں:

اللہ تعالیٰ کے اسما وصفات میں الحاد کا مظاہرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ سب اسما وصفات توقیفی ہیں۔ ان کا اطلاق شریعت پر موقوف ہے۔ کوئی شخص اللہ کے کسی نام اور صفت میں کمی بیشی کرے نہ اپنی طرف سے کوئی نام وصفت مقرر کرے، خواہ اس کے معنی اچھے ہوں۔ ان کے اطلاق و استعمال کے محل کو بھی تبدیل کرنے سے گریز کرے اور صرف ان کے مورد پر اکتفا کرے۔ ہر اسم وصفت کو جوں کا توں بولے اور تلفظ کرے۔

حشر ونشر:

معادِ جسمانی (اخروی زندگی) حق ہے۔ انسانی جسموں کو اکٹھا کیا جائے گا اور ان میں روح ڈالی جائے گی۔ شرعاً اور عرفاً جو بدن یہاں ہیں، یہی بدن وہاں ہوں گے، چاہے لمبے ہوں یا پستہ قد۔ کافر کا ایک دانت احد پہاڑ کے برابر ہو جائے گا۔ جنت والوں کے جسم نہایت لطیف اور جُرد مُرد ہوں گے۔ دیکھو! بچہ جوان اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے، اس کے اجزاے بدن خواہ ہزار بار تبدیل ہو جائیں، مگر وہ وہی بچہ ہوتا ہے جو پہلے تھا۔

سزا وجزا:

قیامت کے دن جزا ملنا، حساب ہونا، پل صراط سے گزرنا، نامۂ اعمال کا ملنا اور اعمال کا ترازو میں وزن کیا جانا؛ یہ سب حق ہے۔ جنت اور جہنم اس وقت موجود ہیں اور جنتیوں اور جہنمیوں کے ساتھ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں گی۔ جہنم اور جنت میں سے کسی کو فنا نہیں ہے، البتہ کسی نص میں ان کی جگہ کی صراحت نہیں آئی ہے کہ اب وہ کہاں ہیں؟ اگرچہ جنت کو آسمان میں اور جہنم کو زمین کے نیچے بتاتے ہیں، مگر درست بات یہ ہے کہ جہاں اللہ نے چاہا، وہاں یہ دونوں موجود ہیں۔ ہم اللہ کی مخلوق کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ جنت، جہنم اور معادِ جسمانی کا وجود تورات وانجیل سے بھی ثابت ہے۔ وللہ الحمد.

مرتکب کبیرہ کا انجام:

کبیرہ گناہ کا مرتکب کوئی مسلمان ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا، بشرطیکہ وہ شرک خفی وجلی سے

بچا رہا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ﴾ [النساء: ۳۱]

[اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے]

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو نماز پنج گانہ اور اس طرح کی دیگر نیکیوں سے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴾ [هود: ۱۱٤]

[بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ یاد کرنے والوں کے لیے یاد دہانی ہے]

جب کبیرہ گناہوں کو حلال اور جائز سمجھ کر ان کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو تو ان سے درگزر جائز ہے، جب کہ گناہ کو حلال جاننا کفر ہے۔ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے افعال دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو اللہ کی اس سنت کے موافق جو عباد و خلق کے درمیان جاری ہے اور دوسرے جو خرقِ عادات کے طور پر ہوں۔

کبیرہ گناہ کا مرتکب جو شخص توبہ کے بغیر مرگیا، اس کو معاف کرنا خرقِ عادات کے باب سے ہوگا۔

جو نصوص سرسری رائے میں متعارض نظر آتی ہیں، ان کی تطبیق کا طریقہ وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔

شفاعت:

شفاعت حق ہے، جو کبیرہ گناہ کے مرتکب موحد کے لیے ہوگی نہ کہ مومن مشرک کے لیے، جیسے قبر پرست، پیر پرست اور امام پرست وغیرہ۔ شفاعت چھے قسم کی ہے:

1. سب سے بڑی شفاعت، جو ''شفاعت کبریٰ'' کے نام سے معروف ہے، وہ ہے جس کے ذریعے بندوں کا حساب کتاب شروع کروایا جائے گا، ان کے حق میں آخری فیصلہ اور حکم دلوایا جائے گا، ان کو لمبا عرصہ کھڑا رہنے سے چھٹکارا اور رہائی ملے گی۔ یہ شفاعت ہمارے رسول ﷺ کے ساتھ خاص ہوگی۔ جب لوگ تمام پیغمبروں کی طرف سے مایوس ہو کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ ﷺ شفاعت کبریٰ کے لیے تیار ہوں گے۔
2. دوسری قسم کی شفاعت یہ ہوگی کہ شفاعت کرنے والے ایک قوم کو حساب کے بغیر جنت میں داخل کرائیں گے۔

3. تیسری شفاعت یہ ہوگی کہ ایک قوم جہنم میں جانے کی مستحق ہوگی، مگر اس شفاعت کی وجہ سے وہ بچ جائے گی۔
4. چوتھی شفاعت یہ ہوگی کہ جو موحد آگ میں گئے ہیں، وہ اس شفاعت کے ساتھ آگ سے باہر نکالے جائیں گے۔ یہ شفاعت کرنے میں انبیا، ملائکہ اور مومن شریک ہوں گے۔
5. پانچوں شفاعت یہ ہوگی کہ اس کے ذریعے جنت میں بلند درجات میسر آئیں گے۔
6. چھٹی شفاعت ان لوگوں سے عذاب میں تخفیف کی غرض سے ہوگی، جن کے حق میں ہمیشہ جہنم میں رہنے کا فیصلہ ہو چکا ہوگا، جیسے ابو طالب کے لیے سفارش ہوگی۔

یاد رہے کہ ہمہ قسم کی شفاعت اللہ کی اجازت سے ہوگی۔ وہی شفاعت کرے گا جسے اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے اور اسی کے حق میں سب شفاعت کرنے والے شفاعت کریں گے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوگی۔ پھر جو مومن بچ جائیں گے اور کوئی ان کی شفاعت نہیں کرے گا تو ان کو خود اللہ تعالیٰ آگ سے باہر نکالے گا۔ غرض کہ کوئی مومن جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی ایمان ہوا، وہ ہمیشہ آگ میں نہیں رہے گا۔ وللہ الحمد.

کبیرہ گناہوں کے مرتکب موحدین کے حق میں یہ شفاعت نصوص واحادیث مستفیضہ سے ثابت ہے۔ اس شفاعت کی اجازت اور حد بندی کی قید کتاب وسنت میں کئی جگہ موجود ہے، جس کا انکار کرنا نری جہالت اور تکبر ہے۔

مرتکبِ کبیرہ کی شفاعت:

رسول اللہ ﷺ کا امتِ اسلام کے اہلِ کبائر کے لیے شفاعت کرنا حق ہے۔ آپ ﷺ قیامت کے دن پہلے شفاعت کرنے والے ہوں گے اور آپ ﷺ ہی وہ پہلے شخص ہوں گے جن کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جن نصوص میں شفاعت کی نفی بیان ہوئی ہے تو اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی اجازت ورضا کے بغیر ہے۔

آپ ﷺ کی اس شفاعت کا مستحق وہ گناہ گار شخص ہوگا جس نے سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی دی ہے اور شرک، کفر اور بدعات مکفرہ کی تمام اقسام سے بچا رہا ہے۔ رہا وہ شخص جس نے قولاً یا فعلاً یا عقیدتاً ایمان کے ساتھ ساتھ شرک بھی کیا

تو اس کی شفاعت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ [النسآء: ١١٦]

[بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے جسے چاہے گا اور جو اللہ کے ساتھ شریک بنائے تو یقیناً وہ بھٹک گیا، بہت دور بھٹکنا]

ریا کاری، تصورِ شیخ، ربط القلب بالشیخ، غیر اللہ سے استغاثہ اور استعانت بغیر اللہ وغیرہ سب شرک خفی کی اقسام ہیں، جن کا مرتکب آپ ﷺ کی مذکورہ شفاعت کا مستحق نہ ہوگا۔

احوالِ قبر:

قبر میں عذاب و تنعیم کا ہونا، منکر اور نکیر کا سوال کرنا اور قبر کا دبانا حق ہے، جو دلائل سمعیہ اور براہین نقلیہ سے ثابت ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ:

﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾ [الغافر: ٤٦]

[جو آگ ہے، وہ اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں]

عذابِ قبر ہی کے متعلق ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ﴾ [السجدة: ٢١]

[اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے]

اس آیت میں عذاب ادنا سے عذابِ قبر اور عذابِ اکبر سے عذابِ آخرت مراد ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

«اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ»[1]

[قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے]

پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ اور سلف صالحین کا عذابِ قبر سے پناہ طلب کرنا مشہور و مستفیض

[1] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٤٦٠) اس کی سند میں "عبیداللہ بن ولید" اور "عطیہ" دو راوی ضعیف ہیں۔ نیز یہ روایت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ دیکھیں: المعجم الأوسط (٢٧٢/٨) لیکن اس کی سند بھی سخت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں "محمد بن ایوب" متروک ہے۔

ہے۔[1] آپ ﷺ نے فرمایا: قبر کے دبانے سے اگر کوئی شخص نجات پاتا تو وہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہوتے، جن کے لیے (ان کی موت کے وقت) رحمان کا عرش ہل گیا۔[2]

قبر مردے کو پکڑ کر دبوچتی ہے جسے ''ضغطہ'' یعنی دبانا اور دبوچنا کہتے ہیں۔ لیکن مومن موحد کے ساتھ قبر کا یہ ضغطہ ایسے ہوگا جیسے ماں اپنے بچے سے معانقہ کرتی ہے۔ وللّٰه الحمد.

اسی طرح قبر میں روح کا لوٹایا جانا بھی حق ہے۔ مومن قبر کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

«رَبِّيَ اللّٰهُ وَدِيْنِيَ الْإِسْلَامُ وَ نَبِيِّ مُحَمَّدٌ ﷺ»[3]

[میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں]

جبکہ کافر کہتا ہے:

«هَاه هَاه لَا أَدْرِيْ»[4] [ہائے افسوس! میں نہیں جانتا] (اس کی اصل صحیحین میں ہے)[5]

موت کے بعد ہر روح کا اپنے جسم کے ساتھ ایک طرح کا تعلق و اتصال ہوتا ہے، جس کے سبب روح مع بدن راحت یا تکلیف محسوس کرتی ہے۔ مومن موحدین کی روحیں علیین میں اور کفار و منافقین کی روحیں سجین میں رہتی ہیں، جب کہ شہدا کی روحیں عرشِ الٰہی کے زیر سایہ رہتی ہیں اور پھر جنت میں چرتی پھرتی ہیں۔

بعثتِ انبیا:

اللہ تعالیٰ کا مخلوق کی طرف رسولوں کو بھیجنا اور بندوں کو انبیا و رسل کی زبانی اوامر و نواہی کا مکلف ٹھہرانا، حق اور سچ ہے۔ انبیا و رسل کا کام یہ ہے کہ بندے دین و دنیا کے جس کام میں راہنمائی کے محتاج ہوں، یہ اس کی وضاحت فرمائیں، انھیں جنت کی بشارت سنائیں اور جہنم سے خبردار کریں۔

اللہ کے رسول کئی امور میں دیگر لوگوں سے ممتاز ہوتے ہیں اور وہ امور دوسرے لوگوں میں بر سبیل اجتماع نہیں پائے جاتے۔ وہی امور ان کے نبی اور رسول ہونے کی دلیل ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے امور خارق عادات معجزات اور دوسرے سلامتِ فطرت، کمالِ اخلاق حسنہ اور اس طرح کے دیگر امور ہیں۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٦)

[2] مسند أحمد (٦/٥٥)

[3] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٧٥٣)

[4] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٧٥٣)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٠)

عصمتِ انبیا:

تمام انبیا کفر اور کفر پر اصرار سے معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ تین طرح سے ان کی عصمت فرماتا ہے: ① ایک تو یہ کہ ان کو سلامتِ فطرت اور کمال اعتدالِ اخلاق کے کمال پر پیدا کرتا ہے۔ وہ معاصی میں رغبت نہیں کرتے، بلکہ اصل فطرت کے اعتبار سے گناہوں سے متنفر ہوتے ہیں۔ ② دوسرے یہ کہ ان کو وحی آتی ہے کہ نافرمانیوں پر عذاب اور اطاعتیں بجا لانے پر ثواب ہوگا، چنانچہ یہ وحی انھیں معاصی سے باز رکھتی ہے۔ ③ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور معاصی کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور کوئی ایسا لطیفہ غیبیہ پیدا کر دیتا ہے جس کے سبب وہ گناہ کرنے سے بچ جاتے ہیں، جس طرح یوسف علیہ السلام کے ساتھ اتفاق ہوا تھا۔

چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ [يوسف: ٢٤]

[اور بلاشبہ یقیناً وہ اس کے ساتھ ارادہ کر چکی تھی اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ کر لیتا اگر یہ نہ ہوتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی]

محمد رسول اللہ ﷺ کے فضائل وخصائص:

ہمارے رسول محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں اور گذشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والے ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔ آپ ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور پاک صاف ہیں۔ آپ ﷺ نے نبوت ملنے سے پہلے اور نبوت ملنے کے بعد کبھی بت پوجا اور نہ کبھی شرک کیا اور کبھی صغیرہ گناہ کے مرتکب ہوئے نہ کبیرہ گناہ کے، آپ ﷺ کی دعوت تمام جن وانس کے لیے عام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ [الفرقان: ١] [تاکہ وہ جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو]

نیز آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

« بُعِثْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً » (رواه مسلم)[1]

[مجھے ساری مخلوق کی طرف معبوث کیا گیا ہے]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣) صحیح مسلم میں « بعثت إلى الخلق كافة » کے بجائے « أرسلت إلى الخلق كافة » کے الفاظ مروی ہیں۔

آپ ﷺ کئی ایک خصوصیات کی وجہ سے تمام انبیا سے افضل ہیں، جیسے آپ ﷺ کی دعوت کا ساری کائنات کے لیے عام ہونا، آپ ﷺ کو جوامع الکلم کا عطا کیا جانا، رعب کے ساتھ آپ ﷺ کی مدد کیا جانا، آپ ﷺ کے لیے غنیموں کا حلال کیا جانا، ساری روے زمین کو (نماز کے لیے) مسجد اور (تیمم کے لیے) طہور بنایا جانا، آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا ساری مخلوق کے لیے عام ہونا،[1] جس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ» (رواه الترمذي و صححه)[2]

[میرے آنے کے بعد انبیا کا سلسلہ منقطع ہوگیا]

ساری اولادِ آدم کا سردار ہونا،[3] آپ ﷺ کو قیامت کے دن حمد کا جھنڈا عطا ہونا،[4] آپ ﷺ کا مقام محمود[5] اور عرش الٰہی کی دائیں جانب کھڑا ہونا[6] اور اس طرح کی دیگر خصوصیات۔

اللہ تعالیٰ کے اجمالی فرمان: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [البقرة: ٢٥٣] [یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی] کے مطابق بعض انبیا کی بعض پر فضیلت قطعی ہے۔

نیز فرمایا:

﴿لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [الإسراء: ٥٥]

[بلاشبہ یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی]

مگر تفصیلی حکم کے مطابق ان کی ایک دوسرے پر فضیلت ظنی امر ہے۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے نبی محمد ﷺ تمام مخلوق سے افضل ہیں۔ بعض نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ انبیا میں

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣)، سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٥٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٨)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٤٨)، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٨)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٥)

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦١١) یہ روایت مرفوعاً ضعیف ہے، البتہ صحیح سند سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے: "ويكسى محمد ﷺ بردة حبرة وهو عن يمين العرش" (مسند أبي يعلى: ١/ ٤٢٧)

سب سے پہلے آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری محمد ﷺ ہیں۔ انبیا میں سے پانچ نبی اولو العزم ہیں اور وہ ہیں: نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسی اور محمد علیہم السلام۔ انبیا پر ایمان لانے میں ان کی تعداد کا لحاظ نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ [الغافر: ٧٨]

[ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے سنایا اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے نہیں سنایا]

رہی وہ روایت جس میں انبیا علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے تو وہ ضعیف ہے۔[1]

کراماتِ اولیا:

کراماتِ اولیا حق ہیں۔ اولیا ان مومنوں کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی شناخت رکھتے ہیں اور وہ اپنے ایمان میں محسن یعنی مخلص ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، کرامات سے اس کی عزت افزائی کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے۔

ولی کی کرامت دراصل نبی کا معجزہ ہے جو اس کے ہاتھ پر صادر فرمایا گیا ہے۔ ولی وہی ہوتا ہے جو اپنی دیانت داری میں سچا ہو، اور دیانت یہ ہے کہ وہ زبان و دل سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرے اور اوامر ونواہی میں رسول اللہ ﷺ کا مطیع اور سنتوں کا متبع ہو۔ اگر وہ اپنے نفس کے لیے حق خود اختیاریت کا دعویٰ کر کے متبع نہیں بنے گا تو وہ ولی نہیں ہے اور اگر ولی ہے تو شیطان کا ولی ہے، رحمان کا ولی نہیں ہے اور اس کی کرامت استدراج، مکروفریب اور شعبدہ بازی ہے۔

ولی کے اوصاف:

اولیا مباح امور میں سے کسی بات میں دوسرے لوگوں سے ممتاز نہیں ہوتے ہیں، لباس میں نہ طعام میں، نہ سواری میں نہ مکان میں، نہ حرفہ میں نہ صنعت میں، بلکہ یہ ساری اصناف امتِ اسلام میں پائی جاتی ہیں، بشرطیکہ وہ اولیا مبینہ طور پر واضح بدعات کو اختیار کرنے والے اور فاسق و فاجر نہ ہوں۔ ولایت اہلِ قرآن، اہلِ علم، اہلِ جہاد، اہلِ تلوار اور اہلِ قلم سب میں ہوتی ہے اور اولیا تاجروں، کاریگروں، کسانوں اور سوار و پیادہ سب میں پائے جاتے ہیں۔ سلف صالحین اہلِ دین اور اہلِ علم کو ''قراء'' کے نام سے پکارتے تھے۔ ان میں علما اور عبادت گزار سب ہی داخل تھے۔ پھر ان کے لیے

[1] کثرتِ طرق کی بنا پر یہ روایت صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٢٦٦٨)

''صوفی'' اور ''فقیر'' کا لفظ ایجاد ہوا، مگر اولیا کا یہ عرف اور پہچان حادث ہے۔

ان جملہ اصناف میں جو شخص اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے، وہی اللہ کے ہاں بڑا بزرگوار ہے۔ جب دو شخص تقوے میں برابر ہوں تو وہ اللہ کے نزدیک بھی درجے میں برابر ہوں گے۔ ولایت پیری مریدی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے تقوی و طہارت درکار ہے۔ اولیا پر واجب ہے کہ وہ کتاب وسنت کا اتباع کریں اور ہر بدعت سے گریز کریں، ورنہ ان کی ولایت میں نقص پیدا ہوگا۔ اولیا میں سے کوئی معصوم نہیں ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہے یا کرے، کتاب وسنت کا اعتبار کیے بغیر اس کی پیروی کی جائے۔ اس عقیدے پر سارے اولیا کا اتفاق ہے۔ جس نے اس کے خلاف کوئی بات کہی، وہ اللہ کا ولی نہیں ہے بلکہ وہ کافر ہے یا جہالت کی وجہ سے کوتاہی کا مرتکب۔ اولیاے رحمان اور اولیاے شیطان کی شناخت کے لیے کتاب ''الفرقان''[1] کا مطالعہ کافی وافی ثابت ہوگا۔

علمِ دین کی فضیلت:

علمِ دین کو عبادت پر کلی فضیلت حاصل ہے اور کثرتِ علم کثرتِ عبادت سے بہتر ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً»[2] [مجھے تو صرف معلم بنا کر معبوث کیا گیا ہے]

آپ ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

﴿رَبِّ زِدْنِي عِلْماً﴾ [اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما]

وہ آفات و بلیات جو علم پر طاری ہوتی ہیں، وہ ان آفات کی نسبت بہت کم ہیں جو آفات زہد وعبادت میں لاحق ہوتی ہیں۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

''ایک فقیہ ہزار عابد سے زیادہ شیطان پر بھاری ہوتا ہے۔''[3]

اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

---

[1] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''الفرقان بين أولياء الرحمان وأولياء الشيطان'' مراد ہے۔

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۲۹) اس کی سند میں داؤد بن زبرقان، بکر بن خنیس اور عبد الرحمن بن زیاد؛ تینوں راوی ضعیف ہیں، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔

[3] سنن ابن ماجه (۲۲۲) اس کی سند میں ''ابو سعد روح بن جناح'' راوی متہم ہے، لہٰذا یہ روایت موضوع ہے۔

﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ۹]

[کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے؟]

اس لفظ ﴿لاَ يَعْلَمُوْنَ﴾ کے عموم میں جاہل عبادت گزار بھی داخل ہیں۔

علم صرف ترجمہ سازی اور حرف شناسی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے، جس سے اس کا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر قاری و مقری عالم نہیں ہوتا، اگرچہ وہ قرآن و حدیث رٹا کرتا ہو۔

مقام صحابہ:

ہم عشرہ مبشرہ، فاطمہ، خدیجہ، عائشہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے جنتی ہونے اور ان کے لیے خیر و بھلائی کی گواہی دیتے ہیں، اس لیے کہ احادیث صحیحہ میں انھیں جنتی قرار دیا گیا ہے۔ نیز ہم دیگر صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ عظام کی توقیر و تعظیم کرتے ہیں اور اسلام میں ان کا بہت بڑا مقام جانتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ بدر اور اہلِ بیعتِ رضوان کو ہم جنتی کہتے ہیں۔ اہلِ بدر تین سو تیرہ آدمی تھے۔ ان کے سوا ہم کسی ولی اللہ کے لیے جنت کی گواہی نہیں دے سکتے ہیں، اگرچہ اس کے حق میں اچھا گمان کرنے والے ایسا کہتے ہیں۔

فضیلتِ صحابہ:

اہلِ سنت اس بات کے قائل ہیں کہ افضل صحابہ خلفاے راشدین ہیں، پھر باقی عشرہ مبشرہ، پھر اہلِ بدر، پھر باقی اہلِ احد، پھر اہلِ بیعت رضوان اور پھر باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

غرض کہ انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم میں سے سابقین اولین دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں۔ رہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اولاد تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اگر کسی کو کوئی فضیلت حاصل ہے تو وہ صرف اس کے علم اور تقوے کے ساتھ ہے۔ اس بارے میں صحیح موقف یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیٹوں کی فضیلت ان کے باپوں کی ترتیب وار فضیلت کے ساتھ ہے سوائے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے، کیونکہ ان کی اولاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کے سبب خلفا کی اولاد پر فضیلت رکھتی ہیں۔ (وہ یہ فضیلت کیوں نہ رکھیں) آخر کار وہ پاک کنبہ اور پاکیزہ اولاد ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ متبع سنت ہوں اور بدعتی نہ ہوں، ورنہ وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے:

﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴾ [هود: ٤٦]

[بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں، بے شک یہ ایسا کام ہے جو اچھا نہیں]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا:

«اِعْمَلِيْ فَإِنِّي لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا» [1]

[(اے فاطمہ!) عمل کرو، کیونکہ میں اللہ کے پاس تجھ سے کچھ کفایت نہیں کر سکتا]

مدتِ خلافت:

رسول اللہ ﷺ کے بعد ابو بکر، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی رضی اللہ عنہم برحق امام ہیں، اس کے بعد خلافت کا دور ختم ہو گیا اور مسلمانوں کو پارہ پارہ کرنے والی بادشاہت کا دور شروع ہو گیا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دو برس تین مہینے خلیفہ رہے، عمر رضی اللہ عنہ ساڑھے دس برس، عثمان رضی اللہ عنہ بارہ برس، علی رضی اللہ عنہ چار برس نو مہینے اور حسن رضی اللہ عنہ چھ مہینے خلیفہ رہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ۳۰ھ کے شروع میں ہوئی، لہٰذا معاویہ رضی اللہ عنہ اور وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے ہیں، وہ سب ملوک اور امرا تھے، خلفا نہیں تھے۔

فضیلتِ شیخین:

رسول اللہ ﷺ کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ سب سے افضل انسان ہیں۔ یہاں ہر لحاظ سے افضلیت مراد نہیں ہے کہ یہ نسب و شجاعت اور قوت و علم وغیرہ کو بھی شامل ہو، بلکہ اسلام میں نفع عظیم کے معنی میں افضلیت ہے۔ یہ بات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما میں دوسروں کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے، لہٰذا علی رضی اللہ عنہ کو شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) پر مطلقاً مقدم کرنا جمہور کے مختار مذہب کے خلاف ہے۔

ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اشاعتِ حق میں ہمتِ بالغہ رکھنے کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے دو امیر اور وزیر تھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ دو جہتیں رکھتے تھے۔ ایک جہت اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنے کی تھی اور

[1] مسند البزار (٣٢٠/٧) امام بزار رحمہ اللہ یہ روایت ذکر کرنے کے بعد فرماتے: "وهذان الحديثان لا نعلمهما يرويان عن حذيفة إلا بهذا الإسناد، ولا نعلم لحذيفة ابنا يقال له: سماك إلا في هذا الحديث" امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه البزار من رواية قطري ... و قطري لم أعرفه" (مجمع الزوائد: ٢٠٧/١) البتہ صحیحین میں یہ روایت بایں الفاظ "يا فاطمة بنت رسول الله سليني بما شئت لا أغني عنك من الله شيئاً" مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦)

دوسری جہت مخلوق کو دینے کی۔ بنا بریں شیخین کو عطائے خلق، لوگوں کی تالیف، ان کو اکٹھا کرنے اور جنگ کی تدبیر کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، اس اعتبار سے گویا وہ دو وزیرِ نبوت تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن کرنا کفر ہے:

ہم خیرو بھلائی کے علاوہ کسی چیز کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کرنے سے اپنی زبانوں کو روکتے ہیں، کیونکہ وہ دین میں ہمارے امام و پیشوا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کی ثنا اور تعریف کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا کون ہوسکتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنا حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي » (رواه الشيخان)[1] [میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی مت دو]

جمہور کا موقف ہے کہ صحابہ کی بدگوئی کرنے والا اس لائق ہے کہ اسے تعزیر لگائی جائے اور بعض مالکیہ کا مذہب ہے کہ اس کی سزا قتل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا ہے:

﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح: ٢٩] [تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے]

اس آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والے اہلِ غیظ پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔

تفتازانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیا ہوا دشنام اور طعن اگر ادلۂ قطعیہ کے خلاف ہے تو کفر ہے، جیسے عائشہ رضی اللہ عنہا پر بدکاری کی تہمت لگانا، ورنہ بدعت اور فسق ہے۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم کرنا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کو واجب کرنے کی وجہ سے امت مرحومہ پر واجب اور لازم ہے۔ یہ وجوب کتاب و سنت سے مفہوم ہوتا ہے۔

مسئلہ تکفیر:

ہم کسی اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہتے۔ اہلِ قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریاتِ دین پر متفق ہیں، جیسے: حدوثِ عالم، حشرِ اجساد اور اللہ تعالیٰ کو تمام کلیات اور جزئیات کا علم ہونا وغیرہ۔ اب جو شخص عمر بھر طاعات و عبادات پر ہمیشہ کاربند رہے، مگر قدمِ عالم، نفیِ حشر یا اللہ تعالیٰ کو تمام جزئیات کے علم کی نفی کا معتقد ہو، وہ اہلِ قبلہ نہیں ہے۔ ان کی عدمِ تکفیر سے مراد یہ ہے کہ جب تک ان کی طرف سے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠)

[2] شرح العقائد النسفية للتفتازاني (ص: ١٦٢، ١٦٣) مكتبه حقانيه، ملتان.

کفر کی کوئی امارت وعلامت نہ پائی جائے گی اور ان سے کوئی موجباتِ کفر چیز صادر نہ ہوگی، تب تک ہم ان پر کفر کا حکم نہیں لگائیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کے صانع، قدیر، علیم ومختار ہونے کی نفی یا غیر اللہ کی عبادت یا انکارِ معاد یا انکارِ نبی یا تمام ضروریاتِ دین اور امہاتِ شرعِ مبین کا انکار۔ جو اس کے علاوہ ہے اس کا قائل مبتدع ہے نہ کہ کافر۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا واجب ہے۔ یہ دین کا ایک مضبوط ستون ہے جو افرادِ امت میں سے ہر شخص پر واجب ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ فتنہ برپا نہ ہو، کیونکہ جب برائی سے منع کرنے پر برائی کا بڑھ جانا لازم آتا ہو تو پھر اس سے انکار جائز نہیں ہے، جیسے ملوک، روسا اور امرا کے خلاف خروج کر کے برائی کا انکار کرنا، کیونکہ یہ ہر شر اور برائی کی جڑ ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے ان امرا کے خلاف قتال کرنے کی رخصت طلب کی جو تاخیر سے نماز ادا کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز ادا کریں، تب تک ان سے مت لڑو۔[1]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم اپنے امیر میں کوئی مکروہ امر دیکھو تو صبر کرو اور اس کی اطاعت سے دست کش نہ ہو جاؤ۔[2] رسول اللہ ﷺ ہجرت سے قبل مکے میں کئی طرح کی منکرات کا مشاہدہ کرتے تھے، مگر انھیں بدل نہ پاتے تھے، حتی کہ جب مکہ فتح ہو کر دار الاسلام بھی بن گیا اور آپ ﷺ نے یہ چاہا کہ بیت اللہ کو اصل بنیادوں پر تعمیر کر دیں، لیکن محض فتنے کے ڈر سے آپ ﷺ نے یہ کام نہ کیا۔[3]

غرض کہ جب یہ گمان ہو کہ امر و نہی مقبول ہوگا، تب ہی اس کو بجا لائے، ورنہ سکوت کرنا اولیٰ اور خاموشی اختیار کرنا ہی مستحسن ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انکارِ منکر کے چار درجے ہیں۔ ایک یہ کہ منکر دور ہو کر اس کی جگہ معروف آ جائے۔ دوسرے یہ کہ بندہ انکار کر سکے، گو اس انکار سے منکر امر دور نہ ہو۔ تیسرے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨١٦)

یہ کہ وہ منکر دور ہو، مگر اس کی جگہ ویسا ہی منکر آ جائے۔ چوتھے یہ کہ اس سے بدتر منکر آ جائے۔ سو پہلے دو درجے مشروع ہیں اور تیسرا درجہ محل اجتہاد ہے اور چوتھا حرام، مثلاً اگر وہ اہلِ فسق و فجور کو دیکھے کہ وہ شطرنج کھیلتے ہیں اور اسے یہ معلوم ہو کہ وہ لوگ میرے انکار سے شطرنج بازی چھوڑ کر تیر اندازی اور گھوڑے دوڑانے کے کام میں مشغول ہو جائیں گے تو اس کا انکار کرنا ٹھیک اور درست ہے، اور اگر ان کے اس شطرنج بازی سے باز آ کر شراب نوشی اور زنا کاری میں ملوث ہونے کا ڈر ہو تو پھر ان پر انکار کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ایک قوم لہو ولعب میں یا موسیقی سننے میں مصروف ہے اور دعوت دینے والا یہ سمجھے کہ اس برائی کا انکار کرنے سے وہ قوم اللہ کی اطاعت کی طرف آ جائے گی تو اسے منع کرے، ورنہ ان کے کسی بڑے منکر میں مبتلا ہونے کے خدشے کے پیش نظر اس کو ترک کر دے۔ یا اگر ایک شخص قصے کہانیوں کی کتابوں کے مطالعے میں مشغول ہے اور اس پر انکار کرنے سے ڈر ہے کہ وہ ان قصوں اور کہانیوں کو چھوڑ کر بدعات اور ضلالات پر مشتمل کتابوں کا مطالعہ شروع کر دے گا تو ایسی جگہ ترکِ نہی بہتر ہے۔

تاتاریوں کے دور میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ایک ایسی قوم پر گزر ہوا جو شراب نوشی میں مصروف تھے، شیخ کے ہمراہیوں میں سے کسی نے ان پر انکار کیا تو شیخ نے فرمایا: انھیں مت چھیڑو۔ شراب کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے ذکر اور نماز ادا کرنے سے روکتی ہے، مگر ان لوگوں کو شراب قتلِ نفوس سے روکتی ہے۔ یہ اگر شراب نہ پیئں گے تو ابھی مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے، ان کی اولاد کو قیدی بنائیں گے اور ان کا مال لوٹیں گے۔

صفاتِ الٰہیہ میں تفویض اور تاویل:

صفاتِ الٰہیہ کے مسئلے میں صرف دو قول ہیں۔ ایک قول ہے تفویض کے ساتھ تسلیم کرنا۔[1] یہ

---

[1] صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں تفویض کا اطلاق دو معانی پر ہوتا ہے:

① تفويض المعنى والكيفية: یعنی صفاتِ باری تعالیٰ کے اثبات میں قرآن وحدیث میں جو الفاظ مذکور ہیں (جیسے استوا، وجہ، ید، سمع، بصر وغیرہ) ہم ان کا معنی جانتے ہیں نہ اس کی کیفیت ہی کا علم رکھتے ہیں۔

② تفويض الكيفية دون المعنى: یعنی صفاتِ باری تعالیٰ کے لیے استعمال کیے گئے الفاظ کا معنی ومفہوم تو واضح اور معلوم ہے، لیکن ہم ان کی کیفیت سے ناواقف ہیں، جیسے امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ "الاستواء معلوم، والكيف مجهول" یعنی استوا کا معنی ومفہوم تو معلوم اور واضح ہے، لیکن اس کی کیفیت و ماہیت مجہول ہے۔ ←

مذہب سلف کا ہے اور یہی حق، سچ اور راجح ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔

دوسرا قول تاویل ہے۔ یہ طریقہ خلف کا ہے، جس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تاویل تکذیب کی ایک شاخ اور فرع ہے۔ ایک جماعت نے اللہ تعالیٰ کے قرب و معیت کی تاویل علم، قدرت اور احاطے کے ساتھ کی ہے۔ سو یہ آیات متشابہ ہیں، ان میں غور و خوض کرنا بے سود ہے، جب کہ آیاتِ استوا محکمات ہیں۔ لہٰذا ایک مومن کے لائق یہ ہے کہ وہ سب صفاتِ الٰہیہ پر ایمان لائے اور ان کی کیفیت میں غور و فکر کرنے سے احتراز کرے اور سلف کے منہج سے تجاوز کرنے کو جائز نہ سمجھے۔

عہدِ میثاق:

کتاب و سنت سے عہدِ میثاق ثابت ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ [الأعراف: ١٧٢]

[اور جب تیرے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پشتوں میں سے ان کی اولاد کو نکالا]

اور مصابیح میں موجود حدیث میں بھی ہے۔[1] مگر معتزلہ نے اس آیت و حدیث کو مجازی معنی پر

← اول الذکر معنی کے اعتبار سے تفویض کا عقیدہ ائمہ سلف اور اہلِ سنت کا عقیدہ نہیں، بلکہ یہ اشاعرہ اور اہلِ بدعت کا عقیدہ ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صفات کے ضمن میں جو الفاظ ذکر کیے ہیں، کوئی بھی ان کے معنی سے آگاہ نہیں، نہ رسول اللہ ﷺ، نہ صحابہ کرام اور نہ سلفِ امت۔ گویا یہ الفاظ عبث اور بے فائدہ ہی ذکر کیے گئے ہیں، جن کا کوئی معنی و مطلب مقصود نہ تھا۔ اس بیان و توضیح ہی سے اس نظریے کا بدیہی البطلان ہونا معلوم ہوجاتا ہے۔

مزید برآں ائمہ سلف سے صفاتِ باری تعالیٰ کے معانی سے متعلق صریح نصوص وارد ہوئی ہیں، جیسے استوا کا معنی ارتفاع اور علو ثابت ہے، لیکن ان کی کیفیت کا علم نہیں۔ اہلِ سنت اگرچہ صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات کرتے ہیں، لیکن وہ تشبیہ کا کلیتاً انکار کرتے ہیں، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ [الشوریٰ: ١١] اس آیت کریمہ میں جہاں تشبیہ و تمثیل کی نفی کی گئی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کے لیے صفاتِ سمع و بصر کا اثبات بھی کیا گیا ہے، جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ صفات کے اثبات سے تشبیہ اور تمثیل لازم نہیں آتی۔

الغرض اول الذکر معنی کے اعتبار سے تفویض کو ائمہ سلف کا عقیدہ قرار دینا درست نہیں، البتہ ثانی الذکر معنی کے اعتبار سے عقیدہ سلف پر تفویض کا اطلاق درست ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ ایسے مشتبہ الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جائے۔

[1] مسند أحمد (١/ ٢٧٢) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦)

محمول کیا ہے اور یہ ان کی غلطی ہے۔ اس میثاق کے بعد جو شخص ایمان لایا، وہ تو تصدیق کرنے والا ہوا اور اپنے قول وقرار پر قائم و دائم رہا، اور جس نے کفر کیا، وہ اس میثاق کو بدلنے والا شمار ہوا۔

ہدایت وضلالت:

اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو گمراہ کیا تو یہ اس کا عدل ہے اور جس کو ہدایت دی تو یہ اس کا فضل ہے۔

ایمان:

ایمان دل سے سچا ماننے، زبان سے سچا کہنے اور جوارح سے عمل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ اطاعت کرنے سے بڑھتا ہے اور گناہ کرنے سے کم ہو جاتا ہے۔ بوقتِ ضرورت زبان کی تصدیق ساقط بھی ہو جاتی ہے۔ جس شخص نے دل سے تصدیق کی اور زبان سے اقرار نہ کیا تو وہ اللہ کے نزدیک مومن ہے،[1] گو احکامِ دنیا میں مومن نہ ہو، اور جس نے زبان سے اقرار کیا اور دل سے تصدیق نہ کی جیسے منافق ہے تو وہ مذکورہ شخص کے برعکس ہے۔

ایمان واسلام ایک ہی چیز ہے:

ایمان و اسلام ایک ہی چیز ہے، کیونکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص مومن تو ہو مگر مسلمان نہ ہو یا مسلمان تو ہو مگر مومن نہ ہو۔ اسلام انقیاد یعنی عمل کرنے اور اطاعت بجا لانے کا نام ہے۔ ایمان تصدیقِ دل وغیرہ کا نام ہے اور احسان اخلاصِ باطن کا نام ہے۔ حدیثِ جبریل میں اسلام و ایمان کے درمیان جو فرق ہے، وہی قابلِ اعتماد ہے۔

کیا ایمان مخلوق ہے؟

خواب وغفلت، بے ہوشی اور موت کے ساتھ ایمان باقی رہتا ہے، اگرچہ یہ حالت معرفت وتصدیق کی ضد ہے۔ اہلِ ثمرقند نے کہا ہے کہ ایمان مخلوق ہے۔ اہلِ بخارا نے کہا ہے کہ یہ مخلوق نہیں ہے، لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بندوں کے افعال و اعمال سب کے سب مخلوق ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ

[1] جو شخص زبان سے ایمان کا اقرار واظہار نہیں کرتا، وہ مومن نہیں، کیونکہ ایمان کے لیے مذکورہ بالا تینوں چیزوں کا وجود واجتماع ناگزیر ہے۔ اگر زبان سے اظہار واقرار کے بغیر ایمان کا وجود ہوتا تو بادشاہِ روم ہرقل اور ابو طالب بھی مومن شمار ہوں گے، لیکن معلوم ہے کہ یہ مومن نہیں تھے، کیوں کہ انھوں نے دل سے تصدیق کے باوجود اپنی زبان اور عملی اعتبار سے آپ ﷺ کو رسول برحق تسلیم نہیں کیا تھا۔

اور جماعت اہلِ حدیث کا کہنا ہے کہ ایمان غیر مخلوق ہے۔ ایمان کے کم اور زیادہ ہونے کی بحث لفظی نزاع کی طرف راجع ہوتی ہے۔

بندوں کے افعال مخلوق ہیں:

بندے کے سارے اختیاری افعال اللہ کی مخلوق ہیں۔ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ جب بندہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کو ایجاد فرما دیتا ہے۔ اسی صورت و قدرت کی بنیاد پر بندے کو کاسب کہتے ہیں اور اس پر مدح و ذم اور ثواب و عقاب مرتب ہوتا ہے۔ حرکتِ جماد اور حرکتِ انسان کے درمیان فرق کرنا کفر، خلافِ شرع اور بداہتِ عقل کے خلاف ہے۔ غیر اللہ کو کسی چیز کا خالق ماننا اور اعتقاد کرنا کفر ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرقہ قدریہ کو اس امت کا مجوسی فرقہ قرار دیا ہے۔[1]

بندے کو اپنے اختیاری افعال میں کچھ اختیار نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی پتھر پھینکنے کا ارادہ کرے، اب اگر وہ قادر حکیم ہوتا تو پتھر کے اندر حرکتِ اختیار بھی پیدا کر دیتا۔

مرتکبِ کبیرہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا:

کبیرہ گناہ انسان کو ایمان سے خارج نہیں کرتا، جس طرح معتزلہ نے کہا ہے، کیوں کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب کے باوجود تصدیق باقی ہے۔ کبیرہ گناہ سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا، جس طرح خوارج کہتے ہیں، بلکہ وہ نافرمان مومن، بدعمل مسلمان اور اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے۔

گناہ گار مسلمان جہنم سے نکال لیے جائیں گے:

کفار جہنم کی آگ میں ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے اور گناہ گار مسلمان اگر جہنم میں جائیں گے تو جلد یا بدیر اس سے باہر نکل آئیں گے، پھر ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

اتباعِ رسول ﷺ:

اتباع صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا بندۂ مومن آپ ﷺ کی دی ہوئی خبر پر ایمان لائے، اس پر عمل کرے اور جس چیز سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے، اس سے باز رہے۔ جس شخص کا قول و فعل رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے بال برابر بھی خلاف ہو، اسے رد کر دے۔ نیت و ارادے میں تفاوت اور فرق کے حسبِ حال تقلید شرک ہے یا کم از کم حرام ہے۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩١)

ہر شخص اپنا مقرر رزق کھا کر فوت ہوتا ہے:

ہر شخص دنیا میں اپنا رزق پورا کرتا ہے اور کوئی شخص کسی غیر کا رزق نہیں کھا سکتا۔ رزق حرام کھانے پر عذاب، رزقِ حلال پر حساب اور شبہے والے رزق پر عتاب ہوگا۔

قتل مقدر کی موت ہے:

قتل ہونے والا اپنی مقدر کی ہوئی موت ہی سے مرا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ [الأعراف: ٣٤]

[پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں]

نیز یہ کہ موت میت کے ساتھ قائم ہے اور اللہ کی مخلوق ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملك: ٢]

[موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے]

موت اور اجل ایک ہی چیز ہے۔

موزوں پر مسح کرنا:

سفر وحضر میں موزوں پر مسح کرنا مقیم کے لیے ایک دن اور رات، جب کہ مسافر کے لیے تین دن اور راتیں سنت صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے۔

قیام رمضان:

رمضان کی راتوں کا قیام، جسے عرفِ عام میں تراویح کہا جاتا ہے، رکعات کی تعداد متعین کیے بغیر سنتِ صحیحہ سے ثابت ہے اور نفل نماز با جماعت ادا کرنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رمضان اور غیر رمضان میں تیرہ رکعت سے زیادہ قیام نہیں کیا تھا جن میں وتر بھی شامل تھا۔ رسول اللہ ﷺ یہ رکعات لمبی لمبی ادا کرتے تھے۔ پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُبی بن کعب سے تخفیف کے ساتھ بیس رکعتیں پڑھوائیں۔[1]

سلف میں بعض لوگ چالیس اور بعض چھتیس رکعتیں پڑھتے تھے اور یہ بات ان میں عام و شائع

[1] موطأ الإمام مالك (١١٥/١) میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حکم سے ابی بن کعب ←

تھی۔اب جو شخص جس طرح بھی قیامِ رمضان کرے گا، وہی بہتر ہے۔ومن زاد زاد الله في حسناته.

رہی افضلیت تو یہ قیام کرنے والوں کے مختلف احوال کے پیشِ نظر مختلف ہے۔ جو لوگ لمبے قیام کے متحمل ہوں، وہ دس رکعت مع تین رکعت وتر پڑھیں، جس طرح رمضان اور غیر رمضان میں رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا اور یہی افضل ہے۔ اگر وہ لمبے قیام کی استطاعت نہ رکھے تو بیس رکعت افضل ہیں، اکثر مسلمانوں کا عمل اسی پر ہے۔ رکعات کی یہی تعداد دس اور چالیس کے عدد کے درمیان ہے۔ اگر چالیس یا اس سے بھی زیادہ پڑھے تو بھی جائز ہے۔[1]

فاجر کی امامت:

ہر نیک و بد اور فاجر و صالح مومن کے پیچھے نماز ادا کرنا جائز ہے۔ اکثر علما کے نزدیک اس نماز کا تارک بدعتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے ولید بن عقبہ کے پیچھے نماز ادا کی تھی، حالانکہ وہ شراب پیتا تھا۔ ہاں سلف نے مبتدع کے پیچھے نماز ادا کرنے کو مکروہ کہا ہے۔ اسی طرح ہر نیک و بد کی نماز جنازہ ادا کرے سوائے اس کے جسے شریعت نے خاص کر دیا ہے، جیسے غال یعنی مالِ غنیمت میں سے خیانت کرنے والا، قاتل نفس یعنی خودکشی کرنے والا، کافر اور شہید[2] نیز قبر پر اور غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا درست ہے۔

ولایت و نبوت:

مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ کوئی ولی نبی کے درجے کو نہیں پہنچتا ہے۔ بعض صوفیہ کا یہ قول کہ ولایت نبوت سے افضل ہے، مردود ہے۔ اس طرح یہ قول بھی مردود ہے کہ خاتمِ اولیا افضل اولیا ہے۔

← اور تمیم داری رضی اللہ عنہما لوگوں کو رمضان میں گیارہ رکعات پڑھایا کرتے تھے۔ بیس رکعت والی روایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں انقطاع ہے۔

[1] مگر راجح بات وہی ہے جو صحیح البخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ حدیث سے ثابت ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «ما كان رسول الله يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعةً» صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٦)، صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٣٨)

[2] قاتلِ نفس وغیرہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا تھا، اگرچہ بطورِ تہدید خود نمازِ جنازہ پڑھانے سے گریز فرمایا۔

عصمتِ اولیا:

ولی کا معصوم ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ اس سے غلطی ہو تی ہے۔ شریعت کے بعض علوم اس پر مخفی رہتے ہیں اور بعض امورِ دین اس پر مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض خوارق کو وہ کرامات سمجھے، جب کہ وہ شیطان کی طرف سے ہوں، تا کہ شیطان اس کا مقام و مرتبہ کم کر دے۔

کشف والہام حجت شرعیہ نہیں ہیں:

الہام، کشف اور خواب حجت شرعیہ ہے نہ ان سے کوئی حکمِ شرع ثابت ہوتا ہے۔ کشفِ اولیا میں اکثر خطا ہوتی ہے اور جو الہام و منام حدیث کے خلاف ہو، وہ مردود ہے، اس پر تمام سلف و خلف کا اجماع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا قول اور بات ہی قطعی حجت ہے اور روایت وحدیث میں کذب اور نسیان کا احتمال ضعیف ہے۔

شرعی خطاب:

جب تک انسان عاقل وبالغ رہتا ہے، اس سے امر و نہی ساقط نہیں ہوتا، کیوں کہ خطاباتِ تکالیف عام ہیں اور مجتہدین کا اس پر اجماع ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر: ٩٩]

[اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آ جائے]

اللہ تعالیٰ سے مایوس یا مامون ہونا دونوں کفر ہیں۔ پہلے فعل کی دلیل فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ اِنَّهٗ لَا يَاْيْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [يوسف: ٨٧] [بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں] ہے اور دوسرے فعل کی دلیل ارشادِ الٰہی: ﴿ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ [الأعراف: ٩٩] ہے۔ مومن کا ایمان خوف و امید کے درمیان ہوتا ہے۔ صرف رجا و امید مرجیہ کا مذہب ہے اور صرف خوف خوارج کا مشرب و مذہب ہے۔ اہلِ سنت امیدوار اور اندیشہ دار ہیں اور یہی حق و سچ ہے۔

کاہن کی تصدیق کرنا کفر ہے:

کاہن کی دی ہوئی غیبی خبر کی تصدیق کرنا کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل: ٦٥]

[اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے، غیب نہیں جانتا]

ایک حدیث میں آیا ہے:

«مَنْ أَتٰى كَاهِناً فَصَدَّقَهُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ» [1]

[جو شخص کسی کاہن کے پاس گیا اور اس کی (بتائی ہوئی غیبی خبر کی) تصدیق کی تو اس نے محمد ﷺ پر اتاری گئی شریعت کے ساتھ کفر کیا]

یہی حکم رمّال، جفار اور فال نکالنے والے کا ہے۔ نیز یہ کہنا کہ اولیا کو علمِ غیب ہے، کفر ہے۔

قبولیتِ دعا:

زندوں کا مردوں کے حق میں دعا کرنا اور ان کی طرف سے صدقہ کرنا مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول کرنے والا اور حاجات کو پورا کرنے والا ہے۔ البتہ کافر کی دعا کی قبولیت میں اختلاف ہے۔

جنوں کو عذاب وثواب ہوگا:

اس بات پر اتفاق ہے کہ جنوں میں سے جو کافر ہیں، انھیں بھی آگ کا عذاب دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ [هود: ١١٩]

[میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے ضرور ہی بھروں گا]

اسی طرح مومن جن جنت میں جائیں گے۔ امام محمد اور قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

قدر کا غلبہ:

سعادت مند مومن کبھی انجام کار مرتد ہو کر بد بخت بن جاتا ہے اور اسی طرح افعالِ سعادت سرانجام دینے کے ساتھ بد بخت کبھی نیک بخت بن جاتا ہے۔

علاماتِ قیامت حق ہیں:

قیامت کی وہ نشانیاں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے، سب حق ہیں، جیسے: غربتِ اسلام، قلتِ علم، کثرتِ جہل، ہرج و مرج، خروجِ دجال، خروج دابۃ الارض، خروجِ یاجوج ماجوج، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور طلوعِ آفتاب از طرف مغرب وغیرہ آیات صغریٰ وفتن کبریٰ۔

[1] سنن أبي داود (٣٩٠٤) سنن الترمذي (١٣٥) سنن ابن ماجه (٦٣٩)

حشر ونشر:

مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ اٹھنا، لوگوں کو مارنے اور دوبارہ زندہ کرنے کے لیے پہلی اور دوسری مرتبہ صور پھونکنا، آسمانوں کا پھٹ جانا، ستاروں کا بکھر جانا، پہاڑوں کا دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑ جانا، زمین کا ویران ہو جانا، اس جہانِ دنیا کے ختم ہونے کے بعد جہانِ آخرت کا برپا ہونا، انوع واقسام کے عذاب اور نعمتوں کا ہونا، جہنم اور جنت کا ہونا، جنت میں حور وقصور کا ملنا اور دوزخ میں سانپ، بچھو، بیڑیوں، اطواق واغلال، گرم پانیوں، تھوہر اور غسلین کا ہونا؛ سب کچھ حق ہے۔

بشر وملائکہ کی افضلیت:

رسلِ بشر رسلِ ملائکہ سے افضل ہیں اور رسلِ ملائکہ بالاجماع بلکہ بالضرورۃ عامۂ بشر سے افضل ہیں اور عامۂ بشر، عامۂ ملائکہ سے افضل ہیں۔

معراج نبوی:

رسول اللہ ﷺ کا معراج حالت بیداری میں اسی بدن عنصری کے ساتھ آسمانِ دنیا تک اور پھر جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا، وہاں تک حق ہے۔ یہ صحیح اور مشہور حدیث سے کئی سندوں کے ساتھ متواتراً ثابت ہے اور ان کا منکر بدعتی اور گمراہ ہے۔ آپ ﷺ کا مسجد حرام سے بیت المقدس تک جانا قطعی اور قرآن سے ثابت ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔ آپ ﷺ کا زمین سے آسمان تک جانا نصِ مستفیض سے ثابت ہے اور اس کا منکر مبتدع ہے۔ آسمان سے جنت وعرش تک جانا اخبار آحاد سے ثابت ہے اور خبر واحد حجت ہوتی ہے۔ عرش سے اوپر تک جانا مختلف فیہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جسے قرآن مجید میں ﴿قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، علما، فقہا، محدثین اور مفسرین رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں کہ آپ ﷺ کو یہ اسرا ومعراج جسدِ اطہر کے ساتھ بیداری کی حالت میں ہوا تھا۔

شبِ معراج رویتِ باری تعالیٰ:

معراج کی رات رسول اللہ ﷺ کے رب تعالیٰ کو دیکھنے میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو سر کی آنکھ سے دیکھا تھا یا دل کی آنکھ سے؟ سلف کی ایک جماعت یہ دونوں موقف رکھتی ہے۔ بہر حال آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا راجح ہے۔ وہ دیکھنا کسی طرح سے بھی ہو اور یہ رویت

دنیا میں نہیں آسمانوں کے اوپر ہوئی تھی۔[1]

معدوم اور شے کی تحقیق:

محققین کے نزدیک معدوم کوئی چیز نہیں ہے اور شے سے مراد امرِ ثابت و متحقق ہے۔ رہی یہ بات کہ معدوم کا نام شے نہیں ہے، یہ ایک لغوی بحث ہے۔

دنیا میں رویتِ باری تعالیٰ ممکن نہیں:

اہلِ سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رویت عینِ بصر کے ساتھ دنیا و آخرت میں عقلاً جائز ہے اور عقبیٰ میں سمعاً ونقلاً ثابت ہے، لیکن دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اس آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا ہے، ہاں خواب میں کیفیت کے بغیر دیکھنا ممکن ہے اور یہ ایک طرح کا دلی مشاہدہ ہے۔

روح:

روح محدث ہے اور یہ بات دینِ اسلام میں ضرورتاً معلوم ہے۔ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام اسی کے قائل تھے۔ اہلِ علم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ جسم اور بدن مر جاتا ہے، مگر روح نہیں مرتی اور اس کو جسدِ خاکی سے جدا ہونے کے بعد نعمتیں ملتی ہیں یا عذاب ہوتا ہے۔

[1] شبِ معراج رویتِ باری تعالیٰ کے سلسلے میں صحابہ کرام اور ائمہ تابعین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مطلقاً رویت کی نفی کرتے ہیں، جیسے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض صحابہ کرام صرف قلبی رویت کا اثبات کرتے ہیں۔ حالتِ بیداری میں آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو شبِ معراج دیکھنا؛ یہ کسی صحابی کا قول نہیں ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے رویتِ باری تعالیٰ کے اثبات کے سلسلے میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، لیکن دوسری روایت میں ان سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دل سے دیکھا ہے۔ (صحیح مسلم: ۸/۳) یہ نص صریح ہے کہ نبی کریم ﷺ کو قلبی رویت حاصل ہوئی تھی، آپ ﷺ نے بیداری کی حالت میں آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ فرمایا: میں نے نور دیکھا ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۵/۳) ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ « حِجَابُهُ النُّورُ » اللہ تعالیٰ کا پردہ نور ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۷۹) یعنی آپ ﷺ نے نور کا پردہ دیکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو بیداری کی حالت میں نہیں دیکھا۔ البتہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور تمام مومن اس رویت سے مشرف ہوں گے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جن صحابہ کرام نے رویت کی نفی کی ہے، اس سے مراد آنکھوں سے دیکھنے کی نفی ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو اثباتِ رویت کا قول مروی ہے، اس سے قلبی رویت مراد ہے، جیسا کہ ان ہی سے ایک دوسری روایت میں مروی ہے۔ امام ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن ابی العز، ابن کثیر اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ نے مذکورہ بالا متعارض روایات میں اسی طرح جمع و تطبیق دی ہے۔

کافر کی دنیوی نعمتیں:

کافر کو دنیا میں نعمت دی جاتی ہے، جیسا کہ فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«اَلدُّنیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ» [1]

[دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے]

لیکن کافر کے لیے دنیا کی یہ نعمت قیامت کے دن نقمت و عذاب بن جائے گی۔

معرفتِ الٰہی:

اللہ تعالیٰ کی شناخت و معرفت حاصل کرنا اور اس کی اطاعت بجا لانا، اللہ تعالیٰ کے اور شرع کے واجب کرنے کے ساتھ، نہ کہ براہِ عقل، واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل آلۂ معرفت ہے اور موجب اس کا اللہ تعالیٰ ہے اور ایمان لانا عقلاً واجب ہے، لیکن پہلا قول ہی راجح ہے۔

وسعت سے زیادہ کسی کو مکلّف نہیں بنایا جاتا:

صحیح ترین موقف یہ ہے کہ کسی کو وسعت و طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں بنایا جاتا۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ٢٨٦]

[اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق]

ممتنع بالغیر [2] کا مکلّف ٹھہرانا شرعاً جائز اور واقع ہے، جیسے فرعون سے یہ کہنا کہ ایمان لاؤ، حالانکہ یہ معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔

جادو اور نظر حق ہے:

جادو اور نظر کا لگنا حق ہے۔ فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«اَلْعَیْنُ حَقٌّ» (رواه الشیخان) [3] [نظر کا لگنا برحق ہے]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٥٦)

[2] "الممتنع: هو الذي يكون عدمه في الخارج ضروريا، فإن اقتضاه الذات فهو الممتنع بالذات (كشريك الباریٔ تعالیٰ) وإن اقتضاه الغير فهو الممتنع بالغير" (دستور العلماء: ٣/٢٣١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨٧)

رسول اللہ ﷺ پر بھی جادو کا اثر ہوا تھا۔

سنت کی حقیقت:

سنت حقیقت میں کسی خاص مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ کتاب وسنت کا وہ منطوق ومفہوم، جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ گزرے ہیں، وہی سنت ہے، جیسے سوالِ قبر، وزنِ اعمال اور پل صراط پر سے گزرنا وغیرہ۔ اس سب کا بیان قرآن وحدیث میں آیا ہے۔ ایک دوسری قوم نے اس کی تاویل کی ہے جو اہلِ بدعت ہیں۔

مجدد:

زمین پر ہر وقت ایک شخص موجود رہتا ہے جو اللہ کی حجت وشریعت پر قائم ہوتا ہے۔ کوئی دور اور زمانہ مجتہد مجدد سے خالی نہیں ہوتا۔ حدیث میں آیا ہے:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ»[1]

[اس امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، کوئی خاذل اور مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے]

اس گروہ سے مراد جماعتِ اہلِ حدیث وقرآن ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اہلِ غلو کی تحریف، اہلِ جہل کی تاویل اور اہلِ باطل کے انتحال کو دور کرتے رہتے ہیں۔[2] ان ہی سے مردہ سنت کا احیا ہوتا ہے اور بدعت محدثہ ختم ہوتی ہے۔ حدیث میں مجدد عالم کو کہا ہے۔[3]

تقلید کا حکم:

اہلِ علم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مسائل شرعیہ فرعیہ میں تقلید کرنا جائز نہیں ہے۔ امام مالک اور جمہور علما کا یہی موقف ہے۔ یہ لوگ تقلید کو باطل اور اجتہاد کو واجب کہتے ہیں۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے تقلید کی ممانعت پر اجماع نقل کیا ہے اور چاروں مجتہدین ائمہ نے تقلید سے منع

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

[2] سنن البيهقي الكبرى (١٠/٢٠٩)

[3] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٤٩١)

کیا ہے۔ بہر حال اگر تقلید کی ممانعت پر اجماع نہ بھی ہو تو جمہور کا مذہب تو ضرور ہے اور تقلید کے عدمِ جواز پر اجماع کی حکایت اس مذہب کی تائید کرتی ہے۔ مجتہد اپنی رائے پر تب عمل کر سکتا ہے جب دلیل موجود نہ ہو۔ کسی دوسرے کو اس کے اجتہاد پر چلنا روا اور جائز نہیں ہے۔

"فهذان الإجماعان يجتثان التقليد من أصله"[1] ولله الحمد.

[پس یہ دونوں اجماع تقلید کو جڑ سے اکھاڑ دیتے ہیں]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جا بجا دین و رسم کے مقلدین کی مذمت فرمائی ہے۔

عامی کے لیے تقلید شخصی کا حکم:

عامی پر ہر واقعے میں معین مذہب کا التزام واجب ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق دو قول ہیں اور دونوں قولوں کی ایک جماعت قائل ہے۔ راجح قول یہ ہے کہ اس پر واجب نہیں ہے۔ ابن برہان اور نووی رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں اور یہی حق ہے۔

مقلد کا ایمان:

ایسے مقلد کا ایمان، جس کے پاس دلیل نہیں ہے، صحیح ہے اور بعض فقہا نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور یہی حق ہے۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مجمل ایمان پر اکتفا کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں معرفتِ دلیل کا مکلّف نہیں ٹھہرایا تھا۔

اجماع:

نفس الامر میں اجماع ممکن ہے، لیکن اس کا وجود مشکل ہے۔ فقہا کی یہ سہل انگاری اور کاہلی ہے کہ وہ جس جگہ اختلاف نہیں پاتے، اجماع کا دعوی کر دیتے ہیں، اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ اہلِ علم، اہلِ دین اور اہلِ تحقیق کی ایک جماعت نے وجودِ اجماع کا انکار کیا ہے۔ پھر اجماع کی بنیاد کتاب و سنت ہوتی ہے اور مجتہدینِ امت کا اجماع معتبر ہوتا ہے نہ کہ عامۂ امت کا، پھر اگر ایک بھی مجتہد نے اختلاف کر دیا تو اجماع نہ رہا۔

قیاس:

ہر قیاس کرنے والے کا قیاس معتبر نہیں، بلکہ صرف مجتہد عالم کا قیاسِ جلی ہی معتبر ہوتا ہے اور

[1] إرشاد الفحول (٢/٢٤٤)

وہ بھی اس وقت جب کتاب وسنت کی کوئی متصادم دلیل نہ ہو اور وہ محض رائے ہونے سے مبرا ہو، کیوں کہ قیاس کرنا تو مجتہد کا کام ہے نہ کہ ہر عامی و عالم کا۔ شریعت میں رائے کا دخل اس کی تحریف کرنے کے مترادف ہے، صرف قضا میں رائے قابل قدر ہے۔

علم تین چیزوں سے عبارت ہے: آیت محکمہ، سنتِ قائمہ اور فریضہ عادلہ؛ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ فضول اور بے سود ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے، "حجة الله البالغة" میں کہا ہے:

"هذا ضبط و تحديد لما يجب عليهم بالكفاية"[1] انتهىٰ.

[یہ وہ ضبط وتحدید ہے جو ان پر واجب کفائی ہے]

قرآن وحدیث کی نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہیں:

قرآن و حدیث کی نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہیں، جب تک کوئی قطعی دلیل ان کو ظاہر سے نہ پھیر دے، خواہ وہ نصوص جہت اور جسمیت ہی کو کیوں نہ بتاتی اور ثابت کرتی ہوں۔ اس سلسلے میں فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشورىٰ: ١١] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں] فوری طور پر ذہن میں پیدا ہونے والے وہم کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ صوفیہ کی وہ تفسیر جو جمہور مفسرین کے خلاف ہو غیر مقبول ہے۔ اس مقام پر اولیاے کاملین اور علماے عالمین کی تصریح کے مطابق قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس مسئلے میں علما و مشائخ کا اختلاف ہوتا ہے، اس جگہ حق وہ ہے جس پر علماے دین گامزن ہیں۔ اسی طرح جس مسئلے میں اہلِ رائے فقہا اور محدثین کا اختلاف ہوتا ہے، وہاں حق اہلِ حدیث کے ساتھ ہوا کرتا ہے، کیونکہ یہ لوگ اہلِ رسول اللہ اور قدوۂ امت ہیں۔

قیامِ خلافت:

مسلمانوں کے لیے ایک امام اور خلیفہ کا ہونا ضروری ہے۔ امام کا کام یہ ہے کہ وہ احکام جاری کرے، حدود قائم کرنے، سرحدوں کی حفاظت کرے، لشکرِ اسلام تیار کرے، صدقات وصول کرے، بے فیض اور زبردستی قابض لوگوں کو زیر کر کے رکھے، راہزنوں کو سزا دے، جمعہ، جماعات اور عیدوں کو قائم کرے، لڑائیوں کو ختم اور جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرے، حقوق کی بابت گواہیوں کی سماعت کرے، لاوارث لڑکے لڑکیوں کی شادی کر دے، غنائم کی تقسیم کرے اور اس طرح کے دیگر انتظامی امور انجام

[1] حجة الله البالغة (١/ ٣٦٢)

دے۔ امام کا قائم کرنا واجب ہے اور یہ وجوب مخلوق پر سمعاً ثابت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے امام بنانے کو ایک اہم کام سمجھا تھا، حتی کہ اس کام کو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین پر بھی مقدم کیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی حدیث میں ہے:

«مَنْ مَاتَ وَ لَيْسَ فِيْ عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً» (رواہ مسلم)[1]

[اپنی گردن میں بیعت کا پٹا ڈالے بغیر مرنے والا شخص جاہلیت کی موت مرا]

مطلب یہ ہے کہ امام کے ہوتے ہوئے جو شخص اس کی بیعت کیے بغیر مرے گا، اس کا یہی حکم ہے کہ وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اگر وقت اس طرح کا ہو کہ امام و خلیفہ موجود نہیں ہے تو پھر امید ہے کہ اس پر یہ حکم نہیں لگے گا۔

شروطِ امامت:

امام و خلیفہ آزاد، مذکر اور عاقل و بالغ ہو نہ کہ عورت، بچہ اور مجنون۔ وہ امام اپنی رائے اور رویے کی قوت اور رعب و دبدبے سے سیاست کرے، نیز وہ احکام کے نفاذ، اسلامی حدود کی حفاظت اور مظلوم کو ظالم سے حق لے کر دینے پر قادر ہو۔ بہادر، صاحبِ رائے، صاحبِ سمع و بصر و نطق ہو۔ اس کا تعلق قریش خاندان سے ہو، کیونکہ اہلِ حل وعقد کے اختیار کے ساتھ غیر قریشی کی امامت و خلافت صحیح نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی زورِ بازو اور زورِ تلوار سے حاکم بن بیٹھے، اگر ایسا ہو تو اس وقت اس کی اطاعت واجب ہوتی ہے، اگرچہ وہ قریشی نہ ہو، کیوں کہ اس کو برخاست کرنے میں اصلاح و فائدے کی نسبت فساد و نقصان زیادہ ہے۔

خلافت کا انعقاد:

خلافت کا انعقاد اہلِ حل وعقد کی بیعت سے ہوتا ہے۔ یعنی جس شخص کو اس ملک کے علما، شرفا، امرا اور معززینِ شہر امام بنا دیں، وہ امام بن جاتا ہے، چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت اسی طرح قائم ہوئی تھی۔ یا اس کا طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ خود وصیت کر جائے کہ میرے بعد فلاں شخص امام ہو جس طرح ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق وصیت کر گئے تھے۔ یا خلیفہ مسئلہ امارت کو بعد والے لوگوں

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥١)

کے مشورے پر موقوف کر جائے جس طرح عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت اسی طرح قائم ہوئی تھی، بلکہ علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی ایسے ہی قائم ہوئی تھی۔ باوجود عدمِ لیاقت و قابلیت کے اپنی اولاد کو ولی عہد بنانا بدعت ہے، کیونکہ خلافت و امامت وراثت نہیں ہے، بلکہ یہ قابلیت و لیاقت اور اہلِ حل و عقد کی رضا پر موقوف ہے۔

خلیفہ سے کب قتال کرنا جائز ہے؟

جب خلیفہ ضروریاتِ دین میں سے کسی ضروری چیز کا انکار کر کے کافر ہو جائے تو اس کے ساتھ قتال کرنا نہ صرف حلال بلکہ واجب ہے، لیکن اس کے ظلم و فسق کی وجہ سے اس کو اس منصب سے معزول نہیں کیا جائے گا۔ سلفِ امت کا اہلِ جور و فسق کی امامت پر گویا اجماع تھا اور یہی حکم ہر قاضی اور امیر کا ہے، مگر امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فسق و جور کی بدولت امام معزول ہو جاتا ہے، لیکن پہلا قول راجح ہے۔

خلیفہ کے خلاف بغاوت کی سزا:

جب ایک شخص خلیفہ مقرر ہو چکا تو اب کوئی دوسرا شخص اٹھ کر اس سے جھگڑا کر کے خلافت چھیننا چاہے تو وہ واجب القتل ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ خلیفہ کے مددگار بن کر اس باغی کو سزا دیں، یہاں تک کہ وہ اپنے اس جھگڑے سے باز آ جائے، لیکن اس معاملے میں اتنی احتیاط کریں کہ کسی بھاگنے والے اور قیدی کو قتل نہ کریں، کسی زخمی کو ہلاک نہ کریں اور نہ اس کا مال ہی لوٹیں، کیونکہ اس میں دفعِ شر اور باغی شخص کی جماعت کو منتشر کرنا مقصود ہے، سو وہ حاصل ہو چکا، ورنہ ان کا حکم محارب کا حکم ہوگا۔

فاسق کی قضا:

علمائے ثلاثہ کے نزدیک فاسق آدمی کو قاضی بنانا درست نہیں ہے اور اس نے رشوت لے کر جو حکم جاری کیا ہے، وہ حکم نافذ نہیں ہوگا۔

افضل التابعین:

اہلِ مدینہ کے نزدیک تابعین رحمہم اللہ میں سے افضل تابعی سعید بن المسیب رحمہ اللہ ہیں۔ اہلِ بصرہ کے نزدیک حسن بصری رحمہ اللہ اور اہلِ کوفہ کے نزدیک اویس قرنی رحمہ اللہ ہیں اور یہی موقف درست ہے،

اس لیے کہ عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ان کو ''خیر التابعین'' فرمایا گیا ہے۔ (رواہ مسلم)[1]

تابعین کی فضیلت:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین رحمہم اللہ امت کے افضل ترین افراد ہیں اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

«خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ»[2]

[زمانوں میں سے بہترین زمانہ میرا ہے، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئیں اور پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئیں گے]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ احناف کے نزدیک تابعی ہیں اور دوسرے لوگوں کے نزدیک وہ امام مالک رحمہ اللہ کی طرح تبع تابعی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ اسی طرح صحاح ستہ کے مولفین خیر القرون میں داخل ہیں۔ صحیح مسلم میں مروی حدیث میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چوتھی صدی کو بھی بہتر قرار دینے کا ذکر آیا ہے۔[3] ان صدیوں اور زمانوں کی فضیلت علم، تقوی اور خیر القرون کے ساتھ قرب کی بنا پر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علماے حدیث کی تعدیل فرمائی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ»[4]

[اس علم کو پچھلے طبقے میں سے وہ لوگ اٹھائیں گے جو عادل ہوں گے]

اس اعتبار سے علماے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معنوی اصحاب ہیں رحمہم اللہ۔ وللہ الحمد.

زمانوں کی فضیلت ہر جہت سے ممکن نہیں:

بعض زمانوں کی بعض پر فضیلت، فضیلت کی ہر ایک جہت سے ممکن نہیں ہے، جس کی دلیل یہ حدیث ہے:

«مَثَلُ أُمَّتِيْ مَثَلُ الْمَطَرِ لَا يُدْرٰى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهُ» (رواه الترمذي)[5]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٢)

[2] التلخيص الحبير (٤/ ٢٠٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٥)

[4] مسند الشاميين (١/ ٣٤٤) مشكاة المصابيح (١/ ٥٣)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٦٩)

[میری امت کی مثال بارش کی مثال ہے، جس کے متعلق یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا اول حصہ بہتر ہے یا آخری]

اس فضلیت کا انداز کچھ یوں ہوگا کہ جمہور قرنِ اوّل جمہور قرنِ ثانی سے افضل ہیں، کیونکہ قرنِ اوّل میں بعض فاسق ومنافق بھی تھے، جیسے حجاج، یزید اور مختار۔ اور اس کے مابعد قرن میں بڑے بڑے علما وصلحا ہوئے، جیسے حفاظ حدیث، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شیخ عبدالقادر جیلانی اور قاضی شوکانی رحمہم اللہ۔

ہر بدعت گمراہی ہے:

حدیثِ صحیح: «كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1] [ہر بدعت گمراہی ہے] کے مطابق ہر بدعت مطلق طور پر ضلالت اور گمراہی ہے۔ بدعت کو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ وغیرہ میں تقسیم کرنا بلا دلیل ہے، کتاب وسنت سے اس کی بو تک محسوس ومشموم نہیں ہوتی۔ شیخ عبدالحق دہلوی حنفی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ اعتصام بالسنہ اگرچہ قلیل ہو، احداثِ بدعت سے بہر صورت بہتر ہے، اگرچہ وہ حسنہ ہو، کیونکہ اتباعِ سنت سے نور پیدا ہوتا ہے اور بدعت سے ظلمت واندھیرا آتا ہے، مثلاً سنت کے مطابق خلا واستنجا کے آداب بجا لانا، رباط ومدرسہ بنانے سے بہتر ہے۔ سنت پر چلنے والا آدابِ سنت کی رعایت کی وجہ سے مقامِ قرب تک ترقی کر جاتا ہے اور مذکورہ آداب کا ترک کرنا ترکِ افضل تک پہنچا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ قساوتِ قلب کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے، جسے کتاب اللہ میں ''رین'' (زنگ) ''طبع'' (مہر) اور ''ختم'' (مہر لگ جانا) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انتهیٰ.

اسی سے ملتے جلتے الفاظ ومفہوم کے ساتھ ملا علی قاری نے ''مرقاة المفاتيح'' میں کلام کیا ہے۔[2] ولله الحمد. تفہیمات میں فرمایا ہے کہ بدعت تین قسم کی ہے۔ ایک وہ جس پر رسول اللہ ﷺ نے بلا عزم کے برانگیخت فرمایا، اس کو تو وہ خوب مضبوطی سے تھام لے، جیسے تراویح کہ یہ بدعت حسنہ ہے۔ دوسری ان مباح عادات کا اختیار کرنا جو سلف میں رائج نہیں تھیں، یہ آسان کام ہے۔ تیسری وہ جس میں کسی سنت کا ترک یا مشروع کی تحریف لازم آتی ہے، یہ ضلالت اور گمراہی ہے۔ انتهیٰ.

مذکورہ بالا اقسامِ بدعت میں سے پہلی قسم درحقیقت سنت حکمیہ ہے، اس کو بدعت کہنا لغوی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

[2] مرقاة المفاتيح (١/ ٤٩٠)

اعتبار سے ہے نہ کہ اصلاحی طور پر۔

توبہ کی ترغیب:

بندے کو ہمیشہ اللہ کے سامنے توبہ بجالانے کا حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ [النور: ٣١] [اور تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو]

صحیح بخاری میں آیا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ ہر روز ستر مرتبہ سے زیادہ توبہ و استغفار کیا کرتے تھے۔[1] جس شخص کو یہ گمان ہے کہ گناہ پر اصرار مضر نہیں ہے، وہ گمراہ ہے اور کتاب و سنت اور سلفِ امت و ائمہ ملت کے اجماع کا مخالف ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ٨]

[اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا]

اور جس شخص نے یہ خیال کیا کہ گناہ گاروں کے لیے تقدیر حجت ہے، وہ مشرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

﴿ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ١٤٩]

[عنقریب وہ لوگ کہیں گے جنھوں نے شریک بنائے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے]

اگر تقدیر گناہوں کے لیے حجت و دلیل ہوتی تو جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی، جیسے قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود وغیرہ تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب میں مبتلا کرتا نہ حد سے تجاوز کرنے والوں پر اقامتِ حدود کا حکم دیتا۔

توبہ کی قبولیت:

توبہ کرنے والے سے گناہ کی سزا کا ساقط کر دینا اللہ تعالیٰ پر عقلاً واجب نہیں ہے، بلکہ معاف کر دینا تو محض اس کا فضل و کرم ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ توبہ کا قبول کرنا شرعاً واقع ہوتا ہے یا نہیں؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٤٨) جبکہ صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٢) میں یہ الفاظ ہیں: «وإني لأستغفر الله في اليوم مائة مرة» [بلا شبہہ میں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں]

تو جس شخص نے کسی کبیرہ گناہ سے توبہ کی ہے، اس کی توبہ صحیح ہے، اگرچہ وہ کسی دوسرے کبیرہ گناہ پر اصرار کیوں نہ کر رہا ہو، اسے اس گناہِ کبیرہ پر، جس سے وہ تائب ہو چکا ہے، عذاب نہیں ہو گا۔ جس شخص نے کبائر سے توبہ کی تو وہ شخص صغائر سے توبہ کرنے سے مستغنی نہیں ہے اور جائز ہے کہ اسے صغائر پر عذاب کیا جائے۔ اہلِ سنت و جماعت کا قطعی طور پر کسی شک و شبہہ کے بغیر یہی قول ہے۔

امام کرمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی شخص صحیح توبہ کر لے تو اب وہ توبہ مقبول اور غیر مردود ہو گی، کیونکہ نص قرآنی کا حکم یہی ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ﴾ [الشوریٰ: ٢٥]

[اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے]

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ توبہ صحیح کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے۔ یہ نری جہالت ہے اور اس کے قائل پر کفر ثابت ہونے کا خدشہ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بلاشک وشبہہ قطعی طور پر توبہ قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ وعدے کا سچا ہے، اس کے وعدے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ جو تائب شخص صحیح توبہ کے قبول ہونے میں شک کرتا ہے، وہ اس اعتقاد کے سبب سے سخت گناہ گار ہے، بلکہ اس کا یہ گناہ پہلے گناہ سے بڑا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب توبہ کی شرائط جمع ہو جاتی ہیں تو وہ ضرور ہی قبول ہوتی ہے۔[1]

"مالا بد منہ" میں کہا ہے کہ جس نے اخلاص کے ساتھ توبہ کی تو حسبِ وعدۂ الٰہی اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے۔[2] انتھیٰ.

جو شخص یہ بات چاہے کہ وہ تمام طوائفِ اسلام کے نزدیک مسلمان ٹھہرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ چھوٹے بڑے تمام گناہوں سے تائب ہو، خواہ گناہ اعمالِ ظاہرہ کے متعلق ہوں یا اخلاق باطنہ کے۔ پھر وہ سارے اقوال و افعال و احوال میں ارتداد میں واقع ہونے سے اپنے نفس کی حفاظت کرے، کیونکہ ارتداد اعمال کو برباد کرنے والا، لوگوں کے برے خاتمے کا سبب بننے والا اور حال و مآل کے اعتبار سے خسران ونقصان کا باعث ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے ارتداد اس کے مقدر میں کیا ہے اور اس سے ارتداد کا ارتکاب ہو گیا ہے تو وہ فی الفور اس سے تائب ہو اور دوبارہ اس کا ارتکاب نہ کرنے کا

[1] إحياء علوم الدين (١٣/٤)

[2] ما لا بد منه للقاضي ثناء الله (ص: ١١)

عزم بالجزم کرے، تاکہ اس کی کھوئی ہوئی سعادت واپس لوٹ سکے۔

فرقہ ناجیہ:

اہلِ علم کا اختلاف ہے کہ فرقۂ ناجیہ کون سا فرقہ ہے؟ درآں حالیکہ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی خیال کرتا ہے۔ اس مسئلے میں "إذا جاء نهر الله بطل نهر معقل"[1] کے مصداق تفسیر نبوی سب اقوال پر مقدم ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خود اس فرقے کو معین فرما دیا ہے۔ اب کسی کے بیان کی حاجت وضرورت نہیں ہے۔ وہ تفسیرِ نبوت یہ ہے کہ فرقہ ناجیہ وہ ہے:

«مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي»[2] (رواه أهل السنن)

[جو اس طریقے پر گامزن ہے جو میرا اور میرے اصحاب کا طریقہ ہے]

چنانچہ سنتِ مطہرہ کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال، افعال، احوال اور ان کی سیر جمع ہیں، یہاں تک کہ کھانے پینے، سونے، جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کی کیفیت بھی بیان ہوئی ہے تو عبادات و معاملات کا بیان کیسے چھوٹ سکتا ہے؟

کتبِ احادیث میں ان چیزوں کا بیان اس طرح سے ہوا ہے، گویا ہم ان کے ان اعمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جس کو سمجھ عطا کی ہو، اس پر اپنے نفس کا حال مخفی نہیں ہے۔ وہ تھوڑی سی توجہ کے ساتھ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ وہ سنن و آثار کا متبع ہے یا نہیں؟ اگر وہ ان کا متبع ہے تو یقیناً وہ فرقہ ناجیہ کا ایک فرد ہے اور اگر وہ ایسا نہیں تو یقیناً وہ فرقہ ناجیہ میں داخل بھی نہیں۔

پھر اسی طرح دوسرے فرقوں کا حال بھی اس پر پوشیدہ نہیں رہ سکتا ہے کہ وہ مبتدع ہیں یا متبع؟ جو شخص اتباع کا دعوے دار ہے اور اپنے آپ کو سنتوں کی اقتدا کرنے والا کہتا ہے تو اس کے افعال و اقوال ہی اس کی تصدیق یا تکذیب کر سکتے ہیں۔ یہ بات جاننا کچھ مشکل نہیں ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا جو حال تھا وہ ہر انسان پر ظاہر ہے۔ متبع کا مبتدع کے ساتھ التباس نہیں ہو سکتا ہے۔ نیز حدیث: «طُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ»[3] [غربا کے لیے خیر و بھلائی ہے] اور حدیث:

---

[1] جب اللہ تعالیٰ کی نہر (بارش) چلتی ہے تو معقل کی نہر بے کار ہو جاتی ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥)

«يَفِرُّوْنَ بِدِيْنِهِمْ مِنَ الْفِتَنِ»[1] [وہ اپنے دین کو بچا کر فتنوں سے بھاگتے ہیں] اور حدیث:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ»[2]

[میری امت کی ایک جماعت قیامت تک ہمیشہ حق پر قائم رہے گی، ان کی مخالفت کرنے والا ان کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا]

مذکورہ دعوے کی شاہد ہیں۔

فرقہ ناجیہ سے کوئی خاص فرقہ جیسے اشعریہ یا ماتریدیہ یا معتزلہ یا مقلدہ مراد نہیں ہے، بلکہ «هُمُ النُّزَّاعُ مِنَ الْقَبَائِلِ»[3] [وہ مختلف قبائل اور فرقوں سے نکلے لوگ ہوں گے] جیسے کہ حدیث میں اس کا بیان ہے۔ یہ وہ فرقہ ہے جو اپنے قول و فعل میں متبع رسول ﷺ ہو، وہ کوئی ہو اور کہیں ہو۔

شاہ ولی رحمہ اللہ نے "حجة الله البالغه" میں کہا ہے:

"فرقہ ناجیہ وہ ہے جو عقیدے و عمل میں کتاب و سنت کے ظاہر اور جمہور صحابہ و تابعین رحمہم اللہ کے طریقے کے موافق ہو، اگرچہ اس کے درمیان کسی امرِ غیر منصوص میں کچھ اختلاف ہو، اور غیر ناجیہ ہر وہ فرقہ ہے جس نے عقیدہ سلف کے خلاف کوئی عقیدہ یا ان کے اعمال کے خلاف کوئی عمل اختیار کیا ہو۔ والله أعلم"[4] انتهى.

اب میں کہتا ہوں:

"هذه عقيدتي بل عقيدة جميع أهل السنة و الجماعة، أدين الله تعالىٰ بها، و أعتمد في الدين عليها ظاهرا إقرارا باللسان و باطنا تصديقا بالجنان، فإن كل ذلك مما وردت به الآيات والأخبار، و شهدت به النصوص والآثار، فمن اعتقد جميع ذلك كان من أهل الحق و عصابة السنة، و فارق أهل الضلالة و حزب البدعة"

---

[1] دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

[3] مسند أحمد (١/ ٣٩٨)

[4] حجة الله البالغة (١/ ٣٥٩)

[یہ میرا بلکہ تمام اہلِ سنت و جماعت کا عقید ہے اور میں اس کے ساتھ اللہ کی فرماں برداری اختیار کرتا ہوں اور دین میں ظاہراً زبان سے اقرار کر کے اور باطناً دیگر اعضا سے تصدیق کر کے، جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے ثبوت پر آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں اور نصوص و آثار اس کی گواہی دیتے ہیں، میں اسی پر اعتماد اور بھروسا کرتا ہوں۔ جس شخص نے مذکورہ چیزوں پر اعتقاد رکھا، وہ اہلِ حق اور اہلِ سنت میں شمار ہوا اور اس نے اہلِ بدعت اور گمراہوں سے اپنے آپ کو بچالیا]

نسأل الله تعالىٰ كمال اليقين و حسن الثبات في الدين لنا ولجميع المسلمين والحمد لله أولاً و آخراً.

خاتمہ:

آج بروز منگل بہ تاریخ ۲۶ شعبان ۱۳۰۵ھ کو یہ رسالہ دو دن میں ختم ہوا۔

ختم الله لنا بالحسنىٰ و زيادة، و رزقنا في الدارين حسن السعادة.